عبدالمجید

Paper — B

Book 35 Marks

Grammar 15

Composition 25 Not literary

ادبی شیرازے

مؤلفہ:- خلیل الرب ایم - اے علیگ

ادبی شیرازے

(حصہ نثر)

برائے

انٹرمیڈیٹ (اردو)

مؤلفہ

خلیل الرب صدیقی بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے علیگ

لکچرار گورنمنٹ بیسک ٹریننگ کالج الٰہ آباد

پبلشر

سری رام مہرا اینڈ کو آگرہ

سنہ ۱۹۵۵ء

قیمت ۱۲؍ ۱ر

پرنٹر عبدالمجید
اسرار کریمی پریس
الہ آباد

فہرست عنوانات

done

Syllabus:

۱- میر امن ، ۲- سر سید احمد خاں

3- مولوی محمد حسین آزاد - 4- حالی -

5- شرر - 6- رتن ناتھ سرشار

7- [illegible] - 8- مجنوں گورکھپوری

مقدمہ

اردو زبان کی ابتدا اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟ اس کے متعلق محققین نے کافی چھان بین کر کے اپنے اپنے نظریے پیش کیے ہیں جن میں سے ایک نظریہ جو مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے تم اس کتاب میں بھی پڑھو گے۔ لیکن اردو کی ابتدا کے متعلق چند باتیں ایسی ہیں جو مسلمہ ہیں اور معرض بحث میں نہیں لائی جا سکتیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی عربی اور فارسی اور ہندوستان کے بسنے والے ہندوؤں کی بھاشاؤں سے مل کر اردو زبان بنی اور شاید اسی لیے پرانے زمانے میں اس کو "ریختہ" بھی کہتے تھے۔ ریختہ کے معنی ہیں گارا یعنی وہ مسالہ جو اینٹوں کو جوڑتا ہے۔ چوں کہ یہ زبان مختلف زبانوں کے الفاظ کو جوڑ کر بنی ہے اس لیے اس کی حیثیت وہی ہے جو ریختہ یا گارا کی ہوتی ہے۔ دوسری بات جو مسلمہ ہے وہ یہ ہے کہ اردو نام نے مسلمانوں کے لشکر میں جنم لیا اور اسی لشکر سے اس کی اشاعت ہوئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ "اردو" ترکی زبان میں لشکر کو کہتے ہیں۔ اردو کی ابتدا کے متعلق تیسری ناقابل انکار حقیقت یہ ہے کہ اس کی داغ بیل اسی وقت سے پڑی جب سے مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں شروع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی زبان یکایک وجود میں نہیں آتی۔ اس کا ارتقا آہستہ آہستہ صدیوں میں ہوتا ہے۔ جب بیرونی فاتح اپنی سلطنت قائم کر کے اندرون ملک میں بس جائیں گے تو ان کو قطعی ایک ایسی زبان کی ضرورت پڑے گی جس کی مدد سے

وہ مفتوح قوم سے لین دین، داد و ستد اور سماجی تعلقات قائم کرسکیں۔ یہ زبان شروع شروع میں ٹوٹی پھوٹی ہوگی اور فاتح و مفتوح کی اپنی اپنی زبانوں کا معجون مرکب ہوگی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ جیوں جیوں فاتح و مفتوح قوم کا اختلاط بڑھے گا یہ مخلوط زبان ترقی کرتی جائے گی۔ چنانچہ اس زبان کے الفاظ قدیم ملفوظات میں یہاں وہاں ملتے ہیں۔

نثر اردو کی ابتدا اس مخلوط زبان کو جو بالخصوص لشکریوں کی زبان تھی علاء الدین کے ظفریاب لشکروں نے گجرات اور دکن میں بھی پھیلا دیا۔ دکن سے علاء الدین کا لشکر واپس آگیا۔ اس کی سلطنت بھی ختم ہوگئی مگر اردو کا جو تخم اس نے وہاں بویا تھا پھوٹا، بڑھا اور پھل پھول لایا۔ اس طرح قدیم دکنی اردو کی بنیاد پڑی۔ ویسے تو اردو کی سب سے پہلی تصنیف امیر خسرو (۱۲۵۵ء تا ۱۳۲۵ء) کی "خالق باری" کو بتایا جاتا ہے مگر محققین کو اس میں شبہ ہے کہ وہ خالق باری جسے ہم سب جانتے ہیں امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے البتہ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے جو رسالہ ۱۳۰۸ء میں اخلاق و تصوف کے بارے میں تصنیف کیا تھا اردو کی سب سے پہلی تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اردو کی قدیم ترین تصانیف جن کا پتہ محققین نے لگایا ہے تمام تر دکنی اردو میں ہیں۔

متقدمین اردو نثر کی تاریخ کو بہ آسانی چند ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور متقدمین کا ہے جو چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوکر اٹھارہویں صدی عیسوی تک رہتا ہے۔ ان میں سب سے پہلا نام شیخ عین الدین گنج العلم کا ہے جو دلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد اور بیجاپور آئے اور جن کا انتقال ۱۳۹۳ء میں ہوا۔ آپ نے دکنی اردو میں چند مختصر رسالے مسائل

فقہ کے متعلق تصنیف کیے تھے مگر اب وہ لاپتہ ہیں۔ یہ دکنی اردو کی سب سے پہلی تصانیف تھیں۔ ان کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا نمبر آتا ہے جو دلی سے گلبرگہ آئے اور جن کا وصال ۱۴۲۲ء میں ہوا۔ آپ کی تصنیف معراج العاشقین اردو کی قدیم ترین کتاب ہے جو حال میں شایع ہوئی ہے۔ اسی صدی کی ایک اور کتاب شرح مرغوب القلوب ہے جس کے مصنف شاہ میران جی شمس العشاق ہیں جو خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ کے بزرگ ہیں۔ انھیں کے سلسلے کے ایک اور بزرگ شاہ برہان الدین جانم ہیں جن کی کتاب کلمۃ الحقائق سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے شروع کی سب سے مشہور کتاب ملا وجہی کی سب رس (سنہ تصنیف ۱۶۳۵ء) ہے جس کو اب انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ایک مشہور کتاب شاہ فضل اللہ فضلی کی "کربل کتھا" یا "دہ مجلس" (سنہ تصنیف ۱۷۳۲ء) ہے جو فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ ہے۔ دوسرا مشہور ترجمہ "نوطرز مرصع" ہے جو میر عطا حسین تحسین اٹاوی نے امیر خسرو کی فارسی کتاب چہار درویش کا کیا ہے۔ انیسویں صدی میں میر امن نے اسی کتاب کا ترجمہ سلیس اردو میں کیا اور اس کا نام باغ و بہار رکھا جس کا ایک قصہ اس مجموعے کا پہلا انتخاب ہے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اسی اٹھارہویں صدی کے آخر کا ایک اور بڑا کارنامہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن شریف (سنہ ترجمہ ۱۷۹۰ء) ہے۔ اسی زمانہ میں مرزا سودا نے میر کی مثنوی شعلۂ عشق کو نثر کا جامہ پہنایا اور اپنے دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا۔ اس بیان سے تم کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اردو نثر اب دکن ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ شمالی ہندوستان میں بھی اردو نثر میں تصانیف و تراجم لکھے جانے لگے۔

اٹھارہویں صدی کے ساتھ اردو نثر کا دور متقدین ختم ہوتا ہے۔ اس نثر کے نمونے تم کو اس مجموعے میں نہ ملیں گے کیوں کہ تم کو ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں بے حد زحمت ہوتی۔ اگر تم کو دلچسپی ہو تو اس کے نمونے ڈاکٹر محی الدین زور کی تالیف ادبی شہ پارے میں دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ دکنی اردو میں عربی و فارسی کے مانوس الفاظ ملتے ہیں اور ہماری روزمرہ کی زبان کے حروف و افعال مسخ شدہ صورت میں پائے جاتے ہیں۔

متوسطین

متوسطین کا دور سنہ ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور انیسویں صدی کے پہلے نصف تک ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دور ان اہل کمال کا ہے جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے دار الترجمہ میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی سرپرستی میں فارسی اور عربی زبانوں سے سلیس اردو میں ترجمے کیے۔ ان میں سب سے پہلا نام میر امنؔ کا ہے جن کو اردو نثر میں وہی درجہ حاصل ہے جو میر تقی کو نظم میں۔ انھوں نے چہار درویش کا ترجمہ سلیس اردو میں کیا اور اس کا نام باغ و بہار رکھا۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے دو سو سال گزر چکے لیکن آج بھی اس کی تازگی میں کوئی کمی نہیں۔ یہ ہے میر امنؔ کی نثر کا کمال۔ فورٹ ولیم کالج میں اور بھی تصانیف ہوئیں مگر میر امنؔ کی کتاب کی نثر اور ان کا اسلوب بیان آج کل کے زبان و بیان سے سب سے زیادہ مماثل ہے۔ دوسرا نام مرزا علی لطف کا ہے۔ جنھوں نے شعرائے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ اردو زبان میں مرتب کیا۔ اس کا نام گلشن ہند ہے۔ سید حیدر بخش حیدری نے قصہ حاتم طائی، طوطا کہانی اور گل زار دانش وغیرہ لکھیں۔ میر شیر علی افسوس نے باغ اردو (سعدی گلستاں کا ترجمہ) اور آرائش محفل لکھی۔ بہادر علی حسینی نے سنہ ۱۸۰۲ء میں مثنوی میر حسن کو نثر کا جامہ پہنایا اور

اس کا نام نثر بے نظیر رکھا۔ اسی طرح اور اہل قلم نے فارسی اور عربی کی مشہور اور مقبول کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان منجھ گئی۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھ گیا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ دوسری زبان میں ادا کیے ہوئے خیالات کی ترجمانی کر سکے۔

متوسطین میں دوسرا گروہ ان اہل قلم حضرات کا ہے جو فورٹ ولیم کالج کے باہر اردو زبان کی خدمت کر رہے تھے۔ ان میں ایک مشہور نام مولوی محمد اسمٰعیل شہید کا ہے جنھوں نے تقویۃ الایمان لکھی۔ انشا اللہ خاں انشاؔ نے دریائے لطافت میں بعض مکالمے اور خطوط لکھے۔ سعادت یار خاں رنگینؔ نے اخبار رنگیں اور امتحان رنگیں دو رسالے لکھے فقیر اللہ گویا نے جو ناسخ کے شاگرد رشید تھے بوستان حکمت کے نام سے ۱۸۳۷ء میں انوار سہیلی کا ترجمہ کیا۔ رجب علی بیگ سرورؔ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور فسانۂ عجائب ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴۵ء میں میر امن دہلوی کی کتاب باغ و بہار کے جواب میں لکھی گئی اور اس دور کی سب سے مشہور کتاب ہے۔ سرورؔ کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور اردو زبان و ادب کے مقابلہ میں دلی اور لکھنؤ والوں میں ہمیشہ سے چشمک رہی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے طرز میں وہی فرق ہے جو بالعموم شعر و ادب کے ان دو مختلف اسکولوں میں پایا جاتا ہے۔ میر امن کے طرز کی امتیازی خصوصیت اس کی سادگی، بے تکلفی، روانی اور تسلسل ہے۔ سرورؔ کے طرز کی خصوصیت آورد و تکلف، خوب صورت تراکیب اور پر شوکت الفاظ کی آویزش ہے۔ سرور کی عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔ ان کا طرز تحریر اس زمانہ کا بہت مقبول اور پسندیدہ انداز تھا۔ مذکورۂ بالا جملہ تصانیف انیسویں صدی کے پہلے نصف کے کارنامے ہیں۔ انیسویں صدی کے درمیانی زمانے کا ایک

مہتم بالشان کارنامہ غالب کے خطوط ہیں۔ غالب نے اردو نثر میں چند مقدمے وتبصرے اور تین مختصر رسالے لطائف غالب، تیغ تیز، اور نامۂ غالب یادگار چھوڑے ہیں لیکن جس چیز نے ان کو اردو نثر کی تاریخ میں بلند رتبہ بخشا ہے وہ ان کے مراسلے ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان مراسلوں نے خطوط نویسی کے قدیم فرسودہ طریقہ کو بدل کر خطوط میں بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی اور روانی پیدا کی اور اس طرح خود غالب کے الفاظ میں مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ یہ خطوط ان کی سیرت اور زندگی کے آئینہ دار ہیں اور ان میں جگہ جگہ ان کی طبعی شوخی اور ظرافت جھلکتی ہے۔ غالب کی نثر کا یہی انداز تھا جسے سرسید اور ان کے رفقائے اختیار کر کے جدید اردو نثر کی بنا ڈالی۔

متاخرین

متاخرین کے دور کی ابتدا سرسید اور ان کے رفقائے کار سے شروع ہوتی ہے۔ خود سرسید کی ادبی سرگرمی انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہی شروع ہو چکی تھی مگر ان کے اصلی کارنامے دراصل ۱۸۲۵ء کے بعد سے شروع ہوئے۔ اس لیے ان کو متاخرین کے دور کا سب سے پہلا ادیب کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو عدالتی زبان بن چکی ہے اور فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے سادہ سلیس اردو لکھنے کا رواج ہو چلا ہے۔ بڑھتی ہوئی تعلیم کا بھی مطالبہ یہی ہے کہ مدرسوں میں ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو سادہ اور سلیس زبان میں ہوں اور طلبہ کو روزمرہ کی کاروباری زندگی میں تقریر و تحریر میں سادہ و سلیس زبان کے استعمال پر قدرت دلائیں۔ اس مقصد کی تکمیل سرسید کی ادبی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ سرسید نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی

قائم کی اور ۱۸۷۲ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور باوجود قدیم اسکول کی مخالفت کے سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی طرح ڈالی ۔ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے علی گڈھ کالج کی بنیاد ڈالی ۔ علی گڈھ تحریک اور رسالہ تہذیب الاخلاق کا اردو نثر کی ترقی پر گہرا اثر پڑا ۔ اس رسالے کے خاص خاص مضمون نگار سرسید کے رفقائے کار اور اردو کے مایۂ ناز نثار تھے ۔ ان میں وقارالملک محسن الملک، مولوی چراغ علی، ڈاکٹر ذکاءاللہ، مولانا حالی اور شبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ خود سرسید نے بکثرت مضامین لکھے ۔ اس مجموعے میں سرسید کی نثر کا جو نمونہ شامل ہے اس کو پڑھ کر تمھیں اندازہ ہوگا کہ سرسید کی نثر تکلفات سے کس قدر عاری ہے اور اس میں سادگی و سلاست کے ساتھ کتنا زور اور اثر ہے ۔ سرسید نے متعدد تصانیف بھی چھوڑی ہیں ۔ ان میں سے چند آثار الصنادید، خطبات احمدیہ، مسلمانوں کی پولٹکل پالیسی وغیرہ ہیں ۔

ادور متاخرین میں یوں تو اور بھی نام ہیں مگر سرسید کے بعد سب سے اہم کارنامہ ان حضرات کے ادبی شاہ کار ہیں جن کو اردو نثر کے عناصر اربعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ، آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد ۔ ان میں سے ہر ایک صاحب طرز ہے ۔ اس زمانے میں اب تک اردو کے جتنے اسالیب بیان ہیں وہ سب انھیں کے اسالیب بیان کی آویزش سے تیار ہوئے ہیں ۔ انھوں نے نثر کے جملہ اصناف سیر و سوانح، تاریخ و تنقید، مذہب و اخلاق سب پر قلم اٹھایا اور اس سلسلے میں جو کچھ لکھا وہ آخری تو نہیں ہے لیکن اگر اردو کے ذخیرۂ ادب سے نکال دیا جائے تو آج بھی اردو نثر تہی مایہ ہو جائے گی ۔ آزاد خوش فکر، خوش گو اور لطیفہ سنج تھے ۔ وہ

مورخ نہ تھے ان کے تذکرۂ آب حیات اور دربار اکبری میں تاریخی اغلاط یقیناً موجود ہیں مگر حکایتی اور بیانیہ نثر کا جو شگفتہ اور دل نشیں پیرایہ انھوں نے نکالا وہ اب بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اسی طرح آزاد اردو میں تمثیل نگاری کے بھی موجد ہوئے جس کا سب سے کام یاب نمونہ ان کی کتاب نیرنگ خیال ہے۔
مولانا حالی اردو کے پہلے نقّاد ہیں جنھوں نے صحیح تنقید کی بنیاد ڈالی اور پہلے پہل اردو شاعری کا ایک نظریہ پیش کیا۔ چنانچہ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری جس کا ایک اقتباس اس مجموعے میں شامل ہے، بہت انقلاب آفریں ثابت ہوا اور جدید اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ اس کے علاوہ حالی اردو کی بعض مشہور سوانح عمریوں کے بھی مصنف ہیں مثلاً یادگار غالب، حیات جاوید اور حیات سعدی۔ ان سے پہلے اس نوع کی سوانح عمریاں نہیں لکھی گئی تھیں۔ حالی کی نثر میں سادگی اور سلاست بدرجہ اتم ہے اور لطف یہ ہے کہ اتنا ہی زور اور اثر پایا جاتا ہے۔ خیالات کی ترتیب اور بیان کے تسلسل کے سبب ان کی نثر ادبی مباحث کے لیے بہت موزوں ہے۔ حالی پر ایک تنقیدی مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے۔ یہ مضمون مجنوں گورکھپوری کا ہے جو دور حاضر کے ایک ممتاز ادیب ہیں۔ شبلی ایک متبحر عالم تھے۔ وہ مورخ، فلسفی اور نقاد تھے کثیر التصنیف ہونے کے باوجود ان کی نثر ادب کے اعلیٰ معیار سے کبھی نیچے نہیں اترتی۔ ان کے انداز بیان میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ زور اور رنگینی ہے۔ ان کی مخصوص تصانیف شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر، الفاروق، سیرت النبی اور سیرت النعمان وغیرہ ہیں۔ شعر العجم سے ایک اقتباس اس مجموعے میں بھی لیا گیا ہے۔ نذیر احمد فارسی اور عربی کے زبردست عالم

اور مصلح قوم تھے۔ آپ کا اصل موضوع تعلیم نسواں اور اصلاح معاشرت تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو کتابیں لکھی تھیں وہ آج بھی سر آنکھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ مثلاً مراۃ العروس، نبات النعش، توبۃ النصوح، موعظہ حسنہ، وغیرہ۔ نذیر احمد کا دوسرا کارنامہ ان کے تراجم تھے جن میں ترجمہ قرآن شریف و تعزیرات ہند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن غالباً ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کی ابتدا کی۔ پلاٹ اور کردار نگاری کی حیثیت سے ان کے ناول ترقی یافتہ نہ سہی مگر ناول نگاری کے ارتقا میں وہی سب سے پہلے زینے ہیں۔ ان کی خاص خاص ناولیں توبۃ النصوح فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت ہیں۔ موخر الذکر سے ایک اقتباس اس مجموعے میں بھی شامل ہے۔ نذیر احمد کے انداز بیان میں تسلسل و روانی ہے۔ ان کتابوں میں جو خاص طور پر خواتین کے لئے لکھی گئی ہیں قلعہ کی ٹکسالی زبان ملتی ہے۔ روزمرہ کی بول چال اور عورتوں کے محاورے پر نذیر احمد کو بڑی قدرت تھی۔ ان کی عبارت میں کہیں کہیں فارسی اور عربی کے بڑے بڑے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو عبارت کی روانی میں خلل ڈالتے ہیں مگر بالعموم وہ ان الفاظ کو بڑی خوبی سے عبارت میں ضم کرتے ہیں۔

دور متاخرین میں لکھنؤ کے تین اہل قلم کو نمایاں حیثیت حاصل ہے! ایک پنڈت رتن ناتھ سرشار، دوسرے عبدالحلیم شرر اور تیسرے منشی سجاد حسین۔ نذیر احمد کی طرح سرشار کا شمار بھی ناول نویسی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے فسانے فسانۂ آزاد، سیر کہسار اور جام سرشار وغیرہ لکھنؤ کی قدیم تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ سرشار زود نویس تھے اور انھوں نے بکثرت لکھا۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب کی صرف تصویر نہیں

کھینچتے بلکہ اس کا خاکہ بھی اڑاتے ہیں۔ لکھنؤ کی زبان اور محاورات پر ان کو بے حد قدرت تھی اور بعض وقت محاورات کے استعمال کی جھونک میں ابتذال کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ فسانۂ آزاد ان کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ بقول آل احمد سرور فسانۂ آزاد نے سرشار کو زندہ جاوید کیا اور بقیہ تصانیف سرشار کی وجہ سے زندہ ہیں۔ شرر بھی سرشار کی طرح زود نویس تھے اور انھوں نے بکثرت لکھا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ناول نگار تھے اور بہ نسبت ان کے پیش روؤں کے ان کے ناولوں میں خامیاں کم تھیں۔ پھر بھی ان کے ناول فنی اعتبار سے مکمل نہیں ہیں۔ انھوں نے اکثر تاریخی ناول لکھے ہیں لیکن وہ ناول جن ممالک اور جن زمانوں کے متعلق ہیں ان کی معاشرت و رسم و رواج کا صحیح اندازہ ان سے نہیں ہوتا۔ ان کے خاص خاص ناول فردوس بریں، ایام عرب اور زوال بغداد وغیرہ ہیں۔ شرر کے قلم نے اردو صحافت کے میدان میں بھی جولانی کی ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف رسالے نکالے جن میں "دل گداز" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ شرر کے مضامین کا مجموعہ کئی جلدوں میں بنام "مضامین شرر" شائع ہو گیا ہے۔ منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ اودھ پنچ ہے جو ۱۸۷۷ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اردو میں طنز و تعریض اور مضحکات کی شروعات در اصل اسی رسالے سے ہوئی۔ منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول حاجی بغلول اب تک دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

دورِ متاخرین پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ اردو نثر کا دورِ زریں ہے۔ اس دور کے کارناموں کو حذف کردیا جائے تو اردو میں پھر کچھ نہیں رہتا۔ اس دور میں نثر کے جملہ اصناف کی بنیاد پڑی اور وہ ترقی پذیر ہوئے۔ اردو میں ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اصطلاحات بھی بکثرت وضع ہوگئیں جن کی بدولت غیر زبانوں سے اردو زبان میں کتابوں کے ترجمے ممکن ہوگئے۔ یہ دور انیسویں صدی کے آخری نصف سے متعلق ہے اور بیسویں صدی سے عصرِ حاضر شروع ہوتا ہے۔

دورِ حاضر دورِ حاضر میں نثر اردو کی ترقی پر جن چیزوں نے سب سے زیادہ اثر ڈالا ان میں سے ایک، اور شاید سب سے زیادہ اہم تعلیم کی ترقی و توسیع ہے۔ مغربی ادبیات کی اشاعت اور مطالعے نے ایک تو مختلف اصناف نثر کا معیار بلند کیا اور دوسرے نئے نئے اسالیب بیان پیدا کئے۔ اس دور میں مختصر افسانہ نگاری، مقالہ نگاری، تنقید نگاری اور مزاحیہ نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا اس روز افزوں ترقی کو امداد اس دوسری چیز سے ملی جس نے نثر اردو پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے یعنی اخبار و رسائل کی اشاعت۔ ان کے ذریعے ادب اردو کی بہت اشاعت ہوئی اور وہ ادبی حلقوں سے نکل کر عام آدمی تک پہنچنے لگا۔ چنانچہ اس دور کے ادیب بیشتر وہی ہیں جو یا کام یاب فسانہ نگار ہیں یا کام یاب مقالہ نگار اور مزاحیہ نگار۔

فسانہ نگاروں میں حسن نظامی، راشد الخیری، پریم چند، نیاز فتح پوری سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبد الغفار اور مجنوں گورکھپوری قابلِ ذکر ہیں

ف

حسن نظامی یوں تو کثیر التصنیف ہیں مگر ان کی شہرت دراصل غدر دہلی کے افسانوں کی بدولت ہے۔ ان کے علاوہ آپ کو روزمرہ کی چھوٹی موٹی چیزوں پر لکھنے کا بھی خاص ملکہ ہے جن کے پردہ میں آپ صوفیانہ نکات کو بہت مزے میں بیان کرتے ہیں۔ آپ کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے، سادہ، سلیس، رواں اور شیریں۔ آپ کے افسانوں اور مضامین کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن میں خاص خاص "بیگمات کے آنسو"، "چٹکیاں اور گدگدیاں"، "کانا باتی اور سی پارۂ دل" وغیرہ ہیں۔ راشد الخیری کو مصور غم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس لئے کہ آپ کو غم و الم کی دل گداز تصویریں کھینچنے میں ید طولی حاصل ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان تصویروں میں رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ آپ کے افسانے اور مضامین جو مختلف رسائل میں شایع ہو چکے ہیں مجموعوں کی صورت میں بھی چھپ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی مستقل تصانیف بھی ہیں جن میں صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی، منازل السائرہ، عروس کربلا اور سمرنا کا چاند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راشد الخیری مولانا نذیر احمد کے صحیح جانشین تھے۔ آپ کا مقصد بھی اصلاح و تعلیم نسواں تھا اور ان کا اسلوب بیان بھی دراصل نذیر احمد کے اسلوب کی ایک پاکیزہ شکل ہے وہی لال قلعہ کی ٹکسالی زبان، وہی روزمرہ، وہی مستورات کے الفاظ و محاورات، جس کے ساتھ سادگی، درد، اثر اور جوش بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ پریم چند نہ صرف دور حاضر بلکہ اردو ادب کے سب سے بڑے مختصر افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ آپ کے مختصر افسانے جو مختلف رسائل و جرائد میں چھپ کر پھر مجموعوں کی شکل میں آئے دنیا کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانوں سے ٹکر کھا سکتے ہیں۔ ویسے تو آپ کے سبھی افسانے اعلیٰ پائے کے ہیں لیکن جو

افسانے سب سے بہترین وہ مختصر افسانہ نگاری کے جملہ فنی مطالبات کو پورا کرتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کے خاص خاص مجموعے پریم پچیسی، پریم تیسی خاک پروانہ، زاد راہ وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ پریم چند نے بہت سے ناول بھی لکھے ہیں جو فن کے اعتبار سے پچھلے اردو ناولوں سے بہتر ہیں۔ ان میں بازار حسن، گئو دان اور میدان عمل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گئو دان ان کا ادبی شاہ کار ہے۔ نیاز فتح پوری مشہور رسالہ نگار کے ایڈیٹر ہیں۔ اس میں آپ کے مقالات اور افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں جو اب مجموعے کی صورت میں آ گئے ہیں۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے نگارستان، جمالستان وغیرہ ہیں۔ مستقل تصانیف میں گہوارۂ تمدن اور صحابیات وغیرہ ہیں۔ نیاز صاحب نے افسانہ نگاری کے علاوہ تنقید ادب پر بھی قلم اٹھایا ہے اور آپ کا شمار اچھے نقادوں میں ہے۔ آپ نے فلسفہ اور مذہب پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ آزادیٔ فکر اور روشن خیالی کی حمایت میں بدنام بھی کافی ہوئے۔ آپ کے افسانوں میں رنگینی اور رومانیت زیادہ ہوتی ہے اور اصلیت نگاری کم۔ آپ کے طرز تحریر نے بہت سی کروٹیں لی ہیں۔ پہلے وہ بہت رنگین تھا اور "شراب شعر" میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا شمار اس قبیل کی تحریروں میں تھا جس کو کسی زمانے میں ادب لطیف کہتے تھے اور جو ٹیگور کے اثر سے اردو ادب میں وبا کی طرح پھیل گیا تھا مگر اب آپ کی نثر بہت متین سنجیدہ اور پر زور ہوتی ہے۔ عربی و فارسی کے مناسب الفاظ کی آویزش سے اس میں ترنم اور دلفریبی ہوتا ہے۔ آپ کا اسلوب مولانا ابوالکلام کے اسلوب کی یاد دلاتا ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ سجّاد حیدر یلدرم بھی اردو کے مشہور افسانہ نگار اور انشا پرداز ہیں۔ آپ نے انگریزی

کے علاوہ ترکی ادب سے بھی استفادہ کیا ہے اور ترکی افسانوں کا ترجمہ کرنے اور ان کا چربہ اتارنے میں بہت کام یاب ہوئے ہیں۔ پریم چند کی طرح آپ نے بھی اردو مختصر افسانہ نگاری کو رواج دیا۔ آپ کے افسانے بہ لحاظ پلاٹ دل چسپ اور باعتبار انداز بیان سحر آفریں ہوتے ہیں۔ اسلوب تحریر شگفتہ اور دل فریب ہوتا ہے فارسی اور اردو کی انوکھی تراکیب سے اس میں عجیب بانکپن اور رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی خاص خاص تصنیفات خیالستان، ثالث بالخیر، حکایات و احتسابات وغیرہ ہیں۔ قاضی عبدالغفار اردو کے مایۂ ناز انشا پرداز بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری میں آپ نے جذبات حسن و عشق کی بے مثل نقاشی اور ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ نقش فرنگ میں جس کا ایک اقتباس اس مجموعے میں شامل ہے آپ نے اپنی سیاحت یورپ کے تاثرات بہت موثر انداز سے لکھے ہیں۔ انداز بیان کی رعنائی اور بانکپن مغربی زبانوں کی جدید نثر کی یاد دلاتی ہے جمہور و صباح روز ناموں میں آپ کے مدیرانہ رشحات قلم اردو صحافت کی دنیا میں معیاری چیزیں ہیں۔ مجنوں گورکھ پوری ایک بلند پایہ نقّاد اور مشہور افسانہ نگار ہیں۔ آپ کی تنقید کا بہترین نمونہ آپ کی کتاب "ادب و زندگی" میں ملے گا" مجنوں کے افسانوں کے کئی مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں آپ نے پہلے انگریزی کے مشہور افسانہ نگار ٹامس ہارڈی کے افسانوں کا چربہ اتارا یہ بہت مقبول ہوئے۔ پھر آپ نے اور افسانے لکھے جن میں مغرب کے اساتذہ فن کی بہت کام یاب تقلید کی۔ ان افسانوں کا موضوع تمام حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

دور حاضر کے مقالہ نگاروں میں پہلا نام مولانا ابو الکلام آزاد کا ہے۔ آپ اردو اور فارسی کے عالم ہیں اور آپ کو علوم اسلامی پر عبور حاصل ہے۔

آپ نے الہلال اور البلاغ نامی دو گراں قدر اخبارات جاری کئے تھے جنھوں نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ آپ کی تصانیف میں سے چند دعوت حق، دعوت عمل، اتحاد اسلامی، خطبات و مضامین وغیرہ ہیں۔ ابھی حال میں آپ کی ایک اور کتاب "غبار خاطر" شائع ہوئی ہے۔ آپکے اسلوب بیان نے اردو کی موجودہ انشاپردازی پر بہت اثر ڈالا ہے۔ آپ عربی و فارسی الفاظ بہت بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں لیکن انتخاب اس قدر موزوں ہوتا ہے کہ وہ طبع سلیم پر گراں نہیں گذرتے۔ ان تحریروں میں عالمانہ شان اور بیان میں شوکت و رعنائی پائی جاتی ہے۔ مولانا اردو کے بے مثل خطیب ہیں اور اس کا اثر آپ کی تحریروں میں صاف نمایاں ہے۔ دوسرا مشہور نام اردو کے مرحوم رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر سر عبدالقادر کا ہے۔ آپ کا رسالہ اردو کا سب سے مشہور اور پرانا رسالہ ہے۔ اس رسالہ نے چند مشہور اہم قلم اور ایڈیٹر پیدا کئے۔ خود سر عبدالقادر صاحب نے بے شمار مضامین اس رسالہ میں لکھے جو زبان و بیان کے لحاظ سے اردو کے معیاری نمونے ہیں۔ مخزن کے مضامین علحدہ جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے شاگرد رشید ہیں اور ان کے جانشین۔ آپ دارالمصنفین کے نگراں ہیں اور آپ ہی کے زیر ارادت رسالہ معارف نکلتا ہے جو ایک بلند پایہ علمی رسالہ ہے۔ اسلوب بیان اور موضوع بیان دونوں میں سید صاحب نے شبلی کی تقلید کی ہے۔ آپ کی خاص تصانیف ارض القران، عمر خیام سیرت عائشہ سیرۃ النبی وغیرہ ہیں۔ مولوی عبدالماجد دریا بادی انشاپرداز بھی ہیں اور فلسفی بھی آپ کی متعدد تصانیف و تراجم شائع ہو چکے ہیں جن میں خاص خاص فلسفۂ جذبات فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے وغیرہ ہیں۔ آپ رسالہ صدق کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

تحریر میں علمیت اور ادبیت جھلکتی ہے۔ انداز بیان سنجیدہ، باوقار اور پرزور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کا شمار اردو زبان کے بڑے محسنوں میں ہے۔ انجمن ترقی اردو کے ناظم کی حیثیت سے مولانا نے بے مثل تصانیف و تراجم شائع کئے ہیں۔ آپ نے بڑی تحقیق و تدقیق سے کام لے کر قدیم دکنی اردو کا ادب تلاش کیا اور ترتیب دے کر مع اپنے مقدمہ کے شایع کیا ہے۔ آپ نے بکثرت کتابوں پر مقدمات لکھے ہیں جو مقدمات عبدالحق کے نام سے شایع ہوئے ہیں ان میں انداز بیان صاف سادہ، سلیس اور سلجھا ہوا ہوتا ہے اور بے لاگ رائیں ملتی ہیں۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے وہ حالی کے مقلد ہیں۔ مہدی حسن اُردو کے جواں مرگ ادیب ہیں۔ آپ کی تحریر انشائے عالیہ اور تنقید عالیہ کا نمونہ ہے۔ صحت فکر، علوئے تخیل اور متانت ذوق آپ کی خصوصیت ہے۔ آپ کے قلم سے افادات مہدی اور مکاتیب مہدی یادگار ہیں۔ منشی دیانرائن نگم اردو کے بہت پرانے لکھنے والے تھے اور ایک طویل عرصہ تک مشہور رسالہ زمانہ کانپور سے آپ کے زیر ادارت نکلتا رہا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اردو اور فارسی میں استعداد کامل رکھتے ہیں اور اردو زبان و ادب پر ان کی تنقیدیں بہت سنجیدہ اور سلجھی ہوئی ہوتی ہیں۔

مزاحیہ نگاری کی ابتدا تو منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ کے ذریعے انیسویں صدی میں کر دی تھی مگر دور متاخرین میں اس صنف نے وہ فنی ترقی نہیں کی جس نے مغربی ادب میں اس کو اس قدر اہمیت دے رکھی ہے۔ دور حاضر میں مزاحیہ نگاری نے خاصی ترقی کی اور فنی اعتبار سے بہت آگے بڑھ گئی فرحت بیگ اردو کے مشہور انشاپرداز اور مزاحیہ نگار ہیں۔ تصویر کشی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں خواہ "پھولوں کی سیر" دکھانی مقصود ہو یا "نذیر احمد کا حلیہ" ان کی ظرافت میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جیساکہ اور نئی اور پرانی

تہذیب کی ٹکر" میں پاؤ گے۔ ان کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ بیان میں غضب کا تسلسل اور روانی ہوتی ہے جس میں مناسب محاورات جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین سات جلدوں میں "مضامین فرحت" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ "پطرس" اردو کے بہت کام یاب مزاحیہ نگار ہیں آپ کا نام احمد شاہ بخاری ہے اور آپ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ آپ عرصہ سے اردو کے لئے مرحوم ہو چکے ہیں۔ آپ کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مضامین پطرس کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ان مضامین میں مزاح کی وہی فنی خوبیاں ہیں جو انگریزی مزاح میں پائی جاتی ہیں۔ انداز بیان میں بے تکلفی، بے ساختگی اور روانی ہے۔ آپ کی ظرافت کا مقصد در اصل ہنسنا ہنسانا ہے اور یہی آپ کی کام یابی کا راز ہے مگر آپ باتوں باتوں میں فطرت انسانی کے بعض پہلوؤں پر خوب روشنی ڈال جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں ظرافت کم اور طنز زیادہ ہے۔ آپ کی ظرافت میں سنجیدگی ہوتی ہے اور سنجیدگی بسا اوقات ظرافت کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ آپ بھی فطرت انسانی کے نبض شناس اور سماج کے نقاد ہیں۔ رشید صاحب کے طنز میں تلخی تو نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ شربت کا گھونٹ نہیں۔ قدیم و جدید، مشرقی و مغربی خیالات کے تصادم اور کش مکش سے جو مضحکہ خیز پہلو پیدا ہوتے ہیں رشید صاحب ان کے بڑے نقاد ہیں۔ مزاحیہ نگار ہونے کے علاوہ وہ اردو کے بلند پایہ انشا پرداز بھی ہیں اور نقاد بھی۔ آپ کے انداز بیان میں اس انشائے عالیہ کا مزا ملتا ہے جس کی طرح مہدی حسن نے ڈالی تھی۔ آپ کی خاص خاص تصانیف مضامین رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ اور طنزیات و مضحکات ہیں۔ موخر الذکر اردو زبان میں طنزیات و مضحکات کی تاریخ ہے جو ہندستانی اکیڈیمی سے شایع ہوئی ہے۔

جیسا کہا جا چکا اردو نثر کی ترقی پر اخبار و رسائل کی اشاعت کا بہت
اثر پڑا۔ اخبار رسائل کے علاوہ اب ایک اور چیز وجود میں آگئی ہے اور وہ
ہے ریڈیو۔ ادھر پانچ سات برس میں جتنی کتابیں نکلی ہیں ان ہی سے اکثر (لکھا جائے گا) بیشتر
ریڈیو کی رہین منت ہیں۔ رشید صاحب کی "خنداں" آل احمد سرور کی کتاب "تنقیدی اشارے"
اور شوکت تھانوی کی "سنی سنائی" وغیرہ پہلے ریڈیو پر نشر ہوئیں اور بعد میں شائع ہوئیں۔
جن ادیبوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر
ہیں یا رہ چکے ہیں یا ان کی تصانیف پہلے رسائل و جرائد میں جستہ جستہ چھپ چکی ہیں۔
تعلیم کی توسیع و اشاعت اور اخبار و رسائل کے علاوہ ایک اور چیز بھی اردو
نثر کی ترقی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہ تیسری چیز ملکی سیاست اور ہندی اردو کی باہمی
نزاع ہے۔ اس نزاع کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ادبی انجمنیں معرض وجود میں آئیں
جنھوں نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی اور اس کو تصانیف و تراجم سے
مالا مال کیا۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو اس کے ناظم ڈاکٹر عبدالحق کا نام ہمیشہ
زندہ رہے گا۔ ملک کے سیاسی حالات ہی کی بدولت وہ تحریک شروع ہوئی
جسے آج کل ترقی پسند ادب کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کا
نظریہ ادب اشتراکی ہے۔ اس ادب کے فن کاروں نے ملک کے سامنے اپنے
مسلک کے اچھے اور برے دونوں نمونے پیش کئے ہیں۔ ان نئے لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر،
راجندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی اور شفیق الرحمان مشہور افسانہ نگار ہیں۔
چند اور مشہور لکھنے والے مولانا ظفر علی خاں، حبیب الرحمان خاں شیروانی اور عبدالسلام ندوی وغیرہ ہیں
دوسرے درجہ کے مگر مشہور مزاحیہ نگاروں میں ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی (مرحوم)، اور شوکت تھانوی ہیں۔
نوجوان سنجیدہ لکھنے والوں میں آل احمد سرور، احتشام حسین، عندلیب شادانی خواجہ احمد فاروقی
امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کے نقاد ہیں اور مغربی فن تنقید کے اصولوں سے
کام لیتے ہیں۔ ان میں آل احمد سرور سب سے ممتاز ہیں۔

مؤلف

قصہ آزاد بخت

(میرامّن)

اے شاہو! بادشاہ کا اب ماجرا سنو،
جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے، اور جو سنا سُنو
کہتا ہوں میں فقیروں کی خدمت میں سربسر
احوال میرا، خوب طرح دل لگا سنو،

میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں اس تخت پر بیٹھا عین عالم شباب کا تھا، اور سارا یہ ملک روم کا میرے حکم میں تھا۔ اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر بدخشاں کے ملک سے آیا اور اسباب تجارت کا بہت سالایا، خبرداروں نے میرے حضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا، میں نے اُس کو طلب فرمایا۔

وہ تحفے ہر ایک ملک کے لائق میری نذر کے لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی، چنانچہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا، نہایت خوش رنگ اور آب دار قد و قامت اور وزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا، اور نہ کسو سے سنا تھا، پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور سند راہ داری کی لکھ دی کہ اس سے ہماری تمام قلمرو میں کوئی مزاحم محصول کا نہ ہو، اور جہاں جاوے

اس کو آرام سے رکھیں ۔ چوکی پہرے میں حاضر رہیں، اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں ۔ وہ تاجر حضور میں دربار کے وقت حاضر رہتا اور آداب سلطنت سے خوب واقف تھا ۔ اور تقریر و خوش گوئی اس کی لائق سننے کے تھی اور میں اس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر سر دربار دیکھا کرتا ۔

ایک روز دیوان عام کئے بیٹھا تھا، اور امرا ارکان دولت اپنے اپنے پائے پر کھڑے تھے، اور ہر ملک کے بادشاہوں کے ایلچی مبارک بادی کی خاطر جو آئے تھے وے بھی سب حاضر تھے ۔ اس وقت میں نے موافق معمول کے اس لعل کو منگوایا جواہر خانے کا داروغہ لے کر آیا، میں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے ایلچی کو دیا ۔ اُن نے دیکھ کر تبسم کیا اور زمانہ سازی سے صفت کی ۔ اسی طرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زبان ہو کر بولے کہ قبلۂ عالم کے اقبال کے باعث یہ میسر ہوا ہے، والا نہ کسو بادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسی رقم بے بہا نہیں لگی ۔ اس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر کہ مرد دانا تھا، اور اسی خدمت پر سرفراز تھا وزارت کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا اور التماس کیا کہ کچھ عرض کیا چاہتا ہوں اگر جان بخشی ہو ۔

میں نے حکم کیا کہ کہہ وہ بولا قبلۂ عالم! آپ بادشاہ ہیں، اور بادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اتنی تعریف کریں، اگرچہ رنگ ڈھنگ سنگ میں لاثانی ہے لیکن سنگ ہے، اور اس دم سب ملکوں کے ایلچی دربار میں حاضر ہیں ۔ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے البتہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے اسے ایسا تحفہ بنایا ہے کہ ہر روز روبرو منگاتا ہے، اور آپ اس کی تعریف

کر کر سب کو دکھاتا ہے۔ پس جو بادشاہ یا راجہ یہ احوال سنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خداوند! ایک ادنیٰ سوداگر نیشاپور میں ہے، اس نے بارہ دانے لعل کے کہ ہر ایک سات مثقال کا ہے پٹے میں نصب کر کے کتے کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ مجھے یہ سنتے ہی غصہ چڑھ آیا، اور کھسیانا ہو کر فرمایا کہ اس وزیر کی گردن مارو۔

جلادوں نے وہیں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں۔ فرنگ کے بادشاہ کا ایلچی دست بستہ روبرو آ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے؟ اس نے عرض کی امیدوار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوں۔ میں نے فرمایا کہ جھوٹ بولنے سے اور بڑا گناہ کون سا ہے خصوصاً بادشاہوں کے روبرو؟ اُن نے کہا، اس کا دروغ ثابت نہیں ہوا، شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے سچ ہو۔ ابھی بے گناہ کا قتل کرنا درست نہیں۔ اُس کا میں نے یہ جواب دیا کہ ہرگز عقل میں نہیں آتا ایک تاجر کہ نفع کے واسطے شہر بہ شہر اور ملک بملک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے، بارہ دانے لعل کے جو وزن میں سات سات مثقال کے ہوں، کتے کے پٹے میں لگا دے۔ اس نے کہا خدا کی قدرت سے تعجب نہیں۔ شاید کہ باشد، ایسے تحفے اکثر سوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ اس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک ملک میں جاتے ہیں اور جہاں سے جو کچھ پاتے ہیں لے آتے ہیں۔ صلاح دولت یہ ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیر وار ہے، تو حکم قید کا ہو، اس لئے کہ وزیر بادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں، اور یہ حرکت سلاطینوں سے بدنما ہے کہ ایسی بات پر کہ جھوٹ سچ اس کا ابھی ثابت نہیں ہوا حکم قتل کا

فرمائیں، اور اس کی تمام عمر کی خدمت اور نمک حلالی بھول جائیں۔
پادشاہ سلامت! اگلے شہریاروں نے بندی خانہ اسی سبب سے ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار اگر کسو پر غضب ہوں تو اُسے قید کریں۔ کئی دن میں غصّہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اس کی ظاہر ہوگی، پادشاہ خون ناحق سے محفوظ رہیں گے، کل روز قیامت میں ماخوذ نہ ہوئیں گے۔ میں نے جتنا اس کے قائل کرنے کو چاہا، اس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ خیر تیرا کہنا پذیرا ہوا، میں خون سے اس کے درگذرا لیکن زنداں میں مقیّد رہے گا، اگر ایک سال کے عرصے میں اس کا سخن راست ہوا کہ ایسے لعل کتے کے گلے میں ہیں تو اس کی نجات ہوگی اور نہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔ فرمایا کہ وزیر کو بندی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ حکم سن کر ایلچی نے زمین خدمت کی چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی آہ واویلا مچا، اور ماتم سرا ہوگیا اس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی نہایت خوب صورت اور قابل، نوشت و خواند میں درست۔ وزیر اس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عمدوں کی اس کی مصاحبت میں اور خواصیں شکیل خدمت میں رہتیں۔ اُن سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔
اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا وہ لڑکی اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچا تھا، اور ڈھولک پکھاوج[1] لئے

---

[1] ایک قسم کا باجا۔

ہوئے ریلہ نجگی کی تیاری کر رہی تھی، اور کڑاہی چڑھا کر گلگلے اور رحم تل ۲
بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اس کی ماں روتی پیٹتی سر کھلے پاؤں ننگے بیٹی کے
گھر میں گئی، اور دو ہتڑا اس لڑکی کے سر پہ ماری اور کہنے لگی۔ کاش تیرے
بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا، تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہوتا، اور باپ کا رفیق ہوتا۔ وزیر
زادی نے پوچھا اندھا بیٹا تمھارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کرتا میں بھی
کر سکتی ہوں۔ ماں نے جواب دیا خاک تیرے سر پہ، باپ پر یہ تباہی
ہے کہ بادشاہ کے روبرو کچھ ایسی بات کہی ہے کہ بندی خانے میں قید ہوا۔
اس نے پوچھا وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی سنوں۔ تب وزیر کے
قبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے
اس نے بارہ عدد لعل بے بہا کتے کے پٹے میں ٹانکے ہیں۔ بادشاہ کو
باور نہ ہوا اسے جھوٹا سمجھا اور اسیر کیا۔ اگر آج کے دن بیٹا ہوتا تو ہر
طرح سے کوشش کر کر اس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا ایرالا کرتا
اور بادشاہ سے عرض معروض کر کے میرے خاوند کو بندی خانے سے مخلصی
دلواتا۔

وزیر زادی بولی، اماں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیے انسان
بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور امیدوار فضل الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے
مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا اور رونا دھونا خوب نہیں۔ مبادا دشمن
اور طرح سے بادشاہ کے پاس لگادیں اور لترے چغلی کھاویں کہ باعث
زیادہ خفگی کا ہو، بلکہ جہاں پناہ کے حق میں دعا کرو، ہم اس کے
خانہ زاد ہیں وہ ہمارا خداوند ہے، وہی غضب ہوا ہے وہی مہربان ہوگا

۱۔ ایک قسم کی خوشی کی نیاز ۲۔ ایک قسم کا حلوا۔

اس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ماں کو سمجھایا کہ کچھ اس کو صبر و قرار آیا، تب اپنے محل میں گئی اور چپکی ہو رہی۔ جب رات ہوئی، وزیر زادی نے دادا کو بلایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑی بہت سی منت کی اور رونے لگی اور کہا میں یہ ارادہ رکھتی ہوں کہ اماں کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مخلصی پاوے، جو تو میرا رفیق ہو، تو میں نیشاپور کو چلوں، اور اس تاجر کو کہ جس کے کتے کے گلے میں ایسے لعل ہیں دیکھ کر جو بن آوے کر آؤں، اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔

پہلے تو اس مرد نے انکار کیا، آخر بہت کہنے سننے سے راضی ہوا تب وزیر زادی نے فرمایا۔ چپکے چپکے اسباب سفر کا درست کرو اور جنس تجارت کی لائق نذر پادشاہوں کے خرید کرو اور غلام و نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں ساتھ لے، لیکن یہ بات کسو پر نہ کھلے۔ دادا نے قبول کیا اور اس کی تیاری میں لگا۔ جب سب اسباب مہیا کیا، اونٹوں اور خچروں پر بار کر کر روانہ ہوا، اور وزیر زادی بھی لباس مردانہ پہن کر ساتھ جا ملی، ہرگز کسو کو خبر نہ ہوئی۔ جب صبح ہوئی وزیر کے محل میں چرچا ہوا کہ وزیر زادی غائب ہے، معلوم نہیں کیا ہوئی۔

آخر بدنامی کے ڈر سے ماں نے بیٹی کا گم ہونا چھپایا، اور وہاں وزیر زادی نے اپنا نام سوداگر بچہ رکھا۔ منزل بمنزل چلتے چلتے نیشاپور میں پہنچی۔ خوشی بہ خوشی کارواں سرا میں جا اتری اور سب اپنا اسباب اتارا رات کو رہی۔ فجر کو حمام میں گئی اور پوشاک پاکیزہ جیسے روم کے باشندے پہنتے ہیں پہنی اور شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ آتے آتے جب چوک میں پہنچی چوراہے

پر کھڑی ہوئی، ایک طرف دوکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جواہر کا ڈھیر لگ رہا ہے اور غلام لباس فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں اور ایک شخص جو سردار ہے، برس پچاس ایک کی اس کی عمر ہے، طالع مندوں کی سی خلعت اور نیم آستین پہنے ہوئے، اور کئی مصاحب باوضع نزدیک اس کے کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وہ وزیرزادی جس نے اپنے تئیں سوداگر بچہ مشہور کیا تھا اسے دیکھ کر متعجب ہوئی، اور دل میں کچھ کر خوش ہوئی کہ جھوٹ نہ کرے جس سوداگر کا میرے باپ نے پادشاہ سے مذکور کیا ہے، اغلب ہے کہ یہی ہو بارے خدایا! اس کا احوال مجھ پر ظاہر کرے۔ اتفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دوکان ہے اس میں دو پنجرے آہنی لٹکتے ہیں، اور اُن دونوں میں دو آدمی قید ہیں۔ اُن کی مجنوں کی سی صورت ہو رہی ہے، کہ چرم و استخواں باقی ہے اور سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں، سر اونڈھائے بیٹھے ہیں اور دو حبشی بد ہیبت مسلح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سوداگر بچے کو اچنبھا آیا، لاحول پڑھ کر دوسری طرف جو دیکھا تو ایک دوکان میں قالیچے بچھے ہیں، ان پر ایک چوکی ہاتھی دانت کی اس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا، ایک کتا جواہر کا پٹا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے، اور دو غلام امرد خوب صورت اس کی خدمت کر رہے ہیں، ایک تو مورچھل جڑاؤ دستے کا لئے جھلتا ہے، اور دوسرا رومال تارکشی[1] کا ہاتھ میں لے کر منہ اور

---

[1] سونے چاندی کے تاروں سے بنا ہوا۔

پاؤں اس کا پونچھ رہا ہے۔ سوداگر بچے نے خوب غور کر کر جو دیکھا تو پڑے ہیں کتے کے بارھوں دانے لعل کے جیسے سنے تھے موجود ہیں۔ شکر خدا کا کیا اور فکر میں گیا کہ کس صورت سے ان لعلوں کو بادشاہ پاس لے جاؤں اور دکھا کر اپنے باپ کو چھڑاؤں؟ یہ تو اس حیرانی میں تھا اور تمام خلقت چوک اور رستے کی اس کا حسن و جمال دیکھ کر حیران تھی، اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔ سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تلک اس صورت و شبیہ کا انسان نظر نہیں آیا۔ اس خواجہ نے بھی دیکھا، ایک غلام کو بھیجا کہ تو جا کر منت اس سوداگر بچے کو میرے پاس بلا لا۔

وہ غلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا کہ اگر مہربانی فرمایئے تو ہمارا خداوند صاحب کا مشتاق ہے، چل کر ملاقات کیجئے۔ سوداگر بچہ تو چاہتا ہی تھا بولا کیا مضائقہ؟ جوں ہی خواجہ کے نزدیک آیا اور اس پر خواجہ کی نظر پڑی ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑی، تعظیم کی خاطر سروقد اٹھا لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا، آپس میں بغل گیر ہوئے۔ خواجہ نے سوداگر بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے برابر بٹھایا، بہت سا تملق کر کے پوچھا کہ اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو، کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟ سوداگر بچہ بولا کہ اس کم ترین کا وطن روم ہے اور قدیم سے استنبول زاد بوم ہے، میرے قبلہ گاہ سوداگر ہیں۔ اب بسبب پیری کے طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی اس واسطے مجھے رخصت کیا ہے کہ کاروبار تجارت کا سیکھوں۔ آج تلک میں نے قدم گھر سے باہر نہ

نکلا تھا، یہ پہلا ہی سفر در پیش ہوا، دریا کی راہ ہوا و پیرانہ پڑا[1] خشکی کی طرف سے قصد کیا، لیکن اس عجم کے ملک میں آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی ملاقات کی آرزو میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضل الٰہی سے خدمت شریف میں مشرف ہوا، اور اس سے زیادہ پایا، تمنّا دل کی بر آئی۔ خدا سلامت رکھے، اب یہاں سے کوچ کروں گا۔

یہ سنتے ہی خواجہ کے عقل و ہوش جاتے رہے، بولا کہ اے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سناؤ، کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمھارا اسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟ سوداگر بچے نے کہا کہ مسافر کا گھر سرا ہے، انھیں وہاں چھوڑ کر میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ خواجہ نے کہا کہ بھٹیار خانے میں رہنا مناسب نہیں، میرا شہر میں اعتبار ہے اور بڑا نام ہے، جلد انھیں بُلوالو۔ میں ایک مکان تمھارے اسباب کے لئے خالی کر دیتا ہوں، جو کچھ جنس لائے ہو، میں دیکھوں ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں تمھیں بہت سا نفع ملے۔ تم بھی خوش ہوگے اور سفر کے ہرج مرج سے بچوگے، اور مجھے بھی چند روز رہنے سے اپنا احسان مند کروگے۔ سوداگر بچے نے اوپری دل سے عذر کیا لیکن خواجہ نے پذیرا نہ کیا، اور اپنے گماشتے کو فرمایا کہ باربردار جلد بھیجو اور کارواں سرا سے اِن کا اسباب منگوا کر فلانے مکان میں رکھواؤ۔ سوداگر بچے نے ایک زنگی غلام کو ان کے ساتھ کر دیا کہ سب مال متاع لدوا کرلے آؤ اور آپ شام تلک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا جب

---

[1] ہمت۔

گذری[1] کا وقت ہو چکا، اور دوکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا، تب دونوں غلاموں میں سے ایک نے کتے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کرسی اور قالیچہ اٹھا لیا، اور ان دونوں حبشی غلاموں نے اُس پنجرے کو مزدوروں کے سر پہ دھر دیا، اور آپ پانچوں ہتھیار باندھے ساتھ ہوئے۔ خواجہ سوداگر بچے کا ہاتھ ہاتھ میں لئے باتیں کرتا ہوا حویلی میں آیا۔

سوداگر بچے نے دیکھا کہ مکان عالی شان لائق بادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لب نہر فرش چاندنی کا بچھا ہے، اور مسند کے روبرو اسباب عیش کا چنا ہے، کتے کی صندلی بھی اسی جگہ بچھائی، اور خواجہ سوداگر بچے کو لے کر بیٹھا، بے تکلف تواضع شراب کی کی دونوں پینے لگے۔ جب سرخوش ہوئے تب خواجہ نے کھانا مانگا، دسترخوان بچھا اور دنیا کی نعمت چنی گئی۔ پہلے ایک لنگری[2] میں کھانا لے کر سرپوش طلائی ڈھانپ کر کتے کے واسطے لے گئے، اور ایک دسترخوان زربفت کا بچھا کر اس کے آگے دھر دی۔ کتے نے صندلی سے نیچے اتر کر جتنا چاہا اتنا کھایا، اور سونے کی لگن میں پانی پیا، پھر چوکی پر بیٹھا۔ غلاموں نے رومال سے ہاتھ منہ اس کا پاک کیا، پھر اس طباق اور لگن کو غلام پنجڑے کے نزدیک لے گئے، اور خواجہ سے کنجی مانگ کر قفل قفسوں کے کھولے۔

ان دونوں انسانوں کو باہر نکال کر کئی سونٹے مار کر کتے کا جھوٹا انھیں کھلایا اور وہی پانی پلایا، پھر تالا بند کر کر تالی خواجہ کے حوالے کی۔ جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شروع کیا۔ سوداگر بچے کو یہ حرکت پسند نہ آئی، گھن کھا کر ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ

---

[1] بازار [2] طشت۔

نے منت کی پر اس نے انکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب اس کا پوچھا کہ تم کیوں نہیں کھاتے؟ سوداگر بچے نے کہا، یہ حرکت تمھاری اپنے تئیں بدنما معلوم ہوئی اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا نجس العین ہے۔ پس خدا کے دو بندوں کو کتے کا جھوٹا کھلانا کس مذہب و ملت میں روا ہے؟ فقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ وے تمھاری قید میں ہیں؟ نہیں تو تم اور وے برابر ہیں۔ اب میرے تئیں شک آیا کہ تم مسلمان نہیں، کیا جانوں کون ہو کہ کتے کو پوجتے ہو؟ مجھے تمھارا کھانا مکروہ ہے جب تلک یہ شبہہ دل سے دور نہ ہو۔

خواجہ نے کہا اے بابا! جو کچھ تو کہتا ہے میں یہ سب سمجھتا ہوں اور اسی خاطر بدنام ہوں کہ اس شہر کی خلقت نے میرا نام خواجہ سگ پرست رکھا ہے، اسی طرح پکارتے ہیں، اور مشہور کیا ہے۔ لیکن خدا کی لعنت کافروں اور مشرکوں پر ہوجیو۔ کلمہ پڑھا اور سوداگر بچے کی خاطر جمع کی۔ تب سوداگر بچے نے پوچھا کہ اگر مسلمان بہ دل ہو، تو اس کا کیا باعث ہے؟ ایسی حرکت کرکے اپنے تئیں بدنام کیا ہے، خواجہ نے کہا اے فرزند! نام میرا بدنام ہے، اور دگنا محصول اس شہر میں بھرتا ہوں، اسی واسطے کہ بھید کسو پر ظاہر نہ ہو۔ عجب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سنے سوائے غم اور غصے کے اسے کچھ اور حاصل نہ ہو۔ تو بھی مجھے معاف رکھ، کہ نہ مجھ میں قدرت کہنے کی اور نہ تجھ میں طاقت سننے کی رہے گی۔ سوداگر بچے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے، کیا ضرور ہے جو ناحق میں زیادہ مجوز[1] ہوں؟ بولا خیر اگر لائق

---

[1] مُصِر۔

کہنے کے نہیں تو نہ کہئے۔ کھانے میں ہاتھ ڈالا، اور نوالا اٹھا کر کھانے لگا۔
دو مہینے تک اس ہوشیاری اور عقل مندی سے سوداگر بچے نے خواجہ کے ساتھ گذران کی کہ کسو پر ہرگز نہ کھلا کہ یہ عورت ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے، اور خواجہ سے روز بروز ایسی محبت زیادہ ہوئی کہ ایک دم اپنی آنکھوں سے جدا نہ کرتا۔

ایک دن عین مے نوشی کی صحبت میں سوداگر بچے نے رونا شروع کیا، خواجہ نے دیکھتے ہی خاطرداری کی اور رومال سے آنسو پونچھنے لگا اور سبب گریہ کا پوچھا۔ سوداگر بچے نے کہا اے قبلہ! کیا کہوں؟ کاش کے تمہاری خدمت میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی، اور یہ شفقت جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں نہ کرتے۔ اب دو مشکلیں میرے پیش آئی ہیں، نہ تمہاری خدمت سے جدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اتفاق یہاں ہو سکتا ہے۔ اب جانا ضرور ہوا، لیکن آپ کی جدائی سے اُمید زندگی کی نظر نہیں آتی۔

یہ بات سن کر خواجہ بے اختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی، اور بولا کہ اے نور چشم! ایسی جلدی اس اپنے بوڑھے خادم سے سیر ہوئے کہ اسے دل گیر کئے جاتے ہو؟ قصد روانہ ہونے کا دل سے دور کرو، جب تلک میری زندگی ہے رہو، تمہاری جدائی سے ایک دم میں جیتا نہ رہوں گا، بغیر اجل کے مرجاؤں گا۔ اور اس ملک فارس کی آب و ہوا بہت خوب اور موافق ہے، بہتر تو یوں ہے کہ ایک آدمی معتبر بھیج کر اپنے والدین کو مع اسباب یہیں بلوا لو، جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو تو میں موجود کردوں۔ جب ماں باپ تمہارے اور گھر بار سب آچکیں

اپنی خوشی سے کاربار تجارت کا کیا کرو۔ میں نے بھی اس عمر میں زمانے کی بہت سختیاں کھینچی ہیں، اور ملک ملک پھرا ہوں۔ اب بوڑھا ہوا، فرزند نہیں رکھتا، میں تجھے اپنے بیٹے سے سوا جانتا ہوں، اور اپنا ولی عہد و مختار کرتا ہوں، میرے کارخانے سے بھی ہوشیار اور خبردار ہو۔ جب تلک جیتا ہوں ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو، جب مرجاؤں گاڑ داب دیجو، اور سب مال و متاع میرا لیجو۔

تب سوداگر بچے نے جواب دیا کہ واقعی صاحب نے زیادہ باپ سے میری غم خواری اور خاطر داری کی کہ مجھے ماں باپ بھول گئے، لیکن اس عاصی کے والد نے ایک سال کی رخصت دی تھی، اگر دیر لگاؤں گا تو وے اس پیری میں روتے روتے مرجائیں گے، پس رضامندی پدر کی خوشنودی خدا کی ہے، اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دعائے بد نہ کریں کہ دونوں جہاں میں خدا کی رحمت سے محروم رہوں۔

اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حکم کیجیے کہ فرمانا قبلہ گاہ کا بجالاوے اور حق پدری سے ادا ہووے اور صاحب کی توجہ کا ادائے شکر جب تلک دم میں دم ہے میری گردن پر ہے۔ اگر اپنے ملک میں بھی جاؤں گا تو ہر دم دل و جان سے یاد کروں گا۔ خدا مسبب الاسباب ہے شاید پھر کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔ غرض سوداگر بچے نے ایسی ایسی باتیں نون مرچیں لگا کر خواجہ کو سنائیں کہ وہ بچارا لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا۔ ازبسکہ اس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا کہنے لگا اچھا، اگر تم نہیں رہتے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا

ہوں - میں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں، بس جب جان چلی جاوے
تو خالی بدن کس کام آوے؟ اگر تو اسی میں رضامند ہے تو چل اور مجھے
بھی لے چل - سوداگر بچے سے یہ کہہ کر اپنی بھی تیاّری سفر کرنے لگا،
اور گماشتوں کو حکم کیا کہ بار برداری کی فکر جلدی کرو -

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی - وہاں کے سوداگروں نے
سن کر سب نے تہیّہ سفر کا کیا - خواجہ سگ پرست نے گنج اور جواہر
بے شمار نوکر اور غلام انگنت تحفے اور اسباب شاہانہ بہت سا ساتھ لے کر
شہر کے باہر تنبو اور قنات اور بیچوبے اور سرا پردے اور کندلے
کھڑے کروا کر اُن میں داخل ہوا - جتنے تجّار تھے اپنی اپنی بساط
موافق مال سوداگری کا لے کر ہم راہ ہوئے، برائے خود ایک لشکر ہو گیا -

ایک دن جوگنی کو بیٹھ دے کر وہاں سے کوچ کیا، ہزاروں اونٹوں
پر تھیلیے اسباب کے اور خچروں پر صندوق نقد جواہر کے لاد کر پانچ سو
غلام دشت قبچاق اور زنگ و روم کے مسلّح صاحب شمشیر تازی اور
ترکی و عراقی و عربی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے - سب کے پیچھے خواجہ اور
سوداگر بچہ خلعت فاخرہ پہنے سکھپال؎ پر سوار اور ایک تخت بغدادی
اونٹ پر کسا اس پر کتا مسند پر سوار ہوا، اور ان دونوں قیدیوں کے
قفس ایک شتر پر لٹکائے ہوئے روانہ ہوئے - جس منزل میں پہنچتے سب
سوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آ کر حاضر ہوتے، اور دستر خوان پر کھانا کھاتے
اور شراب پیتے، خواجہ سوداگر بچے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں شکر خدا
کا کرتا اور کوچ در کوچ چلا جاتا تھا - بارے بخیر و عافیت نزدیک

؎ پالکی -

قسطنطنیہ کے آپہنچے۔ باہر شہر کے مقام کیا۔ سوداگر بچے نے کہا اے قبلہ! اگر رخصت دیجئے تو میں جاکر ماں باپ کو دیکھوں اور مکان صاحب کے واسطے خالی کروں، جب مزاج سامی میں آوے شہر میں داخل ہوجیے۔

خواجہ نے کہا تمھاری خاطر تو میں یہاں آیا، اچھا جلد مل جل کر میرے پاس آؤ، اور اپنے نزدیک میرے اُترنے کو مکان دو۔ سوداگر بچہ رخصت ہوکر اپنے گھر میں آیا سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہوئے کہ مرد کون گھس آیا، سوداگر بچہ یعنی بیٹی وزیر کی اپنی ماں کے پاؤں پر جاگری اور روئی اور بولی، کہ میں تمھاری جائی ہوں سنتے ہی وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اے تتری! تو بڑی شتنا ہو نکلی، اپنا منہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رسوا کیا، ہم تو تیری جان کو رو بیٹھ کر صبر کرکے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جا دفع ہو۔

تب وزیرزادی نے سر پر سے پگڑی اُتار کر پھینک دی اور بولی، اے اماں جان! میں بری جگہ نہیں گئی، کچھ بدی نہیں کی، تمھارے بموجب فرمانے کے بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر یہ سب فکر کی، الحمد للہ! کہ تمھاری دعا کی برکت سے اور اللہ کے فضل سے پورا کام کرکے آئی ہوں کہ نیشاپور سے اس سوداگر کو مع کتے جس کے گلے میں وے لعل پڑے ہیں اپنے ساتھ لائی ہوں اور تمھاری امانت میں بھی خیانت نہیں کی۔ سفر کے لئے مردانہ بھیس کیا ہے، اب ایک روز کا کام باقی ہے وہ کرکر قبلہ گاہ کو بندی خانے سے چھڑاتی ہوں اور اپنے گھر میں آتی ہوں اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ کر خدمت میں آؤں ماں نے جب خوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مردوں کا کام

کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت و محفوظ رکھا ہے، خدا کی درگاہ میں نک گھسنی کی، اور خوش ہو کر بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا اور منہ چوما، بلائیں لیں دعائیں دیں اور رخصت کیا کہ تو جو مناسب جان سو کر، میری خاطر جمع ہوئی۔

وزیرزادی پھر سوداگر بچہ بن کر خواجہ سگ پرست کے پاس چلی۔ وہاں خواجہ کو جدائی اس کی از بسکہ شاق ہوئی، بے اختیار ہو کر کوچ کیا۔ اتفاقاً نزدیک شہر کے ایدھر سے سوداگر بچہ جاتا تھا، اور اودھر سے خواجہ آتا تھا عین راہ میں ملاقات ہوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا۔ بابا مجھ بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا؟ سوداگر بچہ بولا آپ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا، آخر ملازمت کے اشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا، آکر حاضر ہوا۔ شہر کے دروازے پر دریا کے کنارے ایک باغ سایہ دار دیکھ کر خیمہ استادہ کیا اور وہیں اُترے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ باہم بیٹھ کر شراب و کباب پینے لگے۔ جب عصر کا وقت ہوا سیر تماشے کی خاطر خیمے سے نکل کر صندلیوں پر بیٹھے۔ اتفاقاً ایک قراول[1] بادشاہی ادھر آنکلا، ان کا لشکر اور نشست برخاست دیکھ کر اچنبھا ہو رہا اور دل میں کہا، شاید ایلچی کسو بادشاہ کا آیا ہے، کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔

خواجہ کے شاطر نے اس کو آگے بلایا اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں بادشاہ کا میر شکار ہوں، شاطر نے خواجہ سے اس کا احوال کہا، خواجہ نے ایک غلام کافری کو کہا کہ جا کر باز دار سے کہہ کہ ہم مسافر

---

[1] بندوق چی۔

ہیں، اگر جی چاہے تو آؤ بیٹھو، قہوہ قلیان حاضر ہے۔ جب میر شکار نے
نام سوداگر کا سنا زیادہ متعجب ہوا، اور تبسّم کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں
آیا، لوازم اور شان و شوکت اور سیاہ و غلام دیکھے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ
کو سلام کیا اور مرتبہ سگ کا نگاہ کیا، ہوش اس کے جاتے رہے۔ ہکّا
بکّا سا ہو گیا۔ خواجہ نے اسے بٹھلا کر قہوے کی ضیافت کی۔ قراول نے
نام و نشانِ خواجہ کا پوچھا۔ جب رخصت مانگی خواجہ نے کئی تھان
اور کچھ تحفے اسے دے کر اجازت دی۔ صبح کو جب بادشاہ کے
دربار میں حاضر ہوا، درباریوں سے خواجہ سوداگر کا ذکر کرنے لگا۔
رفتہ رفتہ مجھ کو خبر ہوئی، میر شکار کو میں نے روبرو طلب کیا اور
سوداگر کا احوال پوچھا۔

اس نے جو کچھ دیکھا تھا عرض کیا۔ سنتے ہی خبر کتے کے تجمل کی
اور دو آدمیوں کے پنجڑے میں قید ہونے کی مجھ کو خفگی آئی۔ میں
نے فرمایا وہ مردود تاجر واجب القتل ہے۔ جلّادوں کو حکم کیا کہ جلد جاؤ،
اس بے دین کا سر کاٹ لاؤ۔ قضا کار وہی ایلچی فرنگ کا دربار میں حاضر
تھا مسکرایا۔ مجھے اور بھی غضب زیادہ ہوا، فرمایا کہ اے بے ادب!
بادشاہوں کے حضور میں بے سبب دانت کھولنے ادب سے باہر ہیں،
بے محل ہنسنے سے رونا بہتر ہے۔ اس نے التماس کیا۔ جہاں پناہ!
کئی باتیں خیال میں گذریں لہٰذا فدوی متبسم ہوا۔ پہلے یہ کہ وزیر بچا ہے
اب قید خانے سے رہائی پاوے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ خون ناحق سے
اس وزیر کے بچے، تیسرے یہ کہ قبلہ عالم نے بے سبب اور بے تقصیر اُس
سوداگر کو حکم قتل کا کیا۔ ان حرکتوں سے تعجب آیا کہ بے تحقیق ایک

بے وقوف کے کہنے سے آپ ہر کسو کو حکم قتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خدا جانے فی الحقیقت اس خواجہ کا احوال کیا ہے! اسے حضور میں طلب کیجیے اور اُس کی واردات پوچھیے، اگر تقصیر وار ٹھہرے تب مختار ہو، جو مرضی میں آوے اس سے سلوک کیجیے۔

جب ایلچی نے اس طرح سمجھایا مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا، فرمایا جلد سوداگر کو اس کے بیٹے کے ساتھ اور وہ سگ اور قفس حاضر کرو۔ قورچی[1] اس کے بلانے کو دوڑ ائے، ایک دم میں سب کو حضور میں لے آئے، روبرو طلب کیا۔ پہلے خواجہ اور اس کا پسر آیا، دونوں لباس فاخرہ پہنے ہوئے۔ سوداگر بچے کا جمال دیکھنے سے سب ادنیٰ اعلیٰ حیران اور بھیچک ہوئے۔ ایک خوان طلائی جواہر سے بھرا ہوا کہ ہر ایک رقم کی چھوٹ نے سارے مکان کو روشن کر دیا سوداگر بچہ ہاتھ میں لئے آیا، اور میرے تخت کے آگے نچھاور کیا، آداب کورنشات بجا لا کر کھڑا ہوا۔ خواجہ نے بھی زمین چومی اور دعا کرنے لگا، اس گویائی سے بولتا تھا کہ گویا بلبل ہزار داستان ہے۔ میں نے اس کی لیاقت کو بہت پسند کیا لیکن عتاب کی رو سے کہا، اے شیطان آدمی کی صورت! تو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے، اور اپنی راہ میں کنواں کھودا ہے؟ تیرا کیا دین ہے اور یہ کون آئین ہے؟ کس پیغمبر کی اُمّت ہے؟ اگر کافر ہے تو بھی یہ کیسی مت ہے اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟

ان نے کہا قبلۂ عالم کی عمر و دولت بڑھتی رہے، غلام کا دین یہ ہے کہ خدا واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ

---

[1] شاہی دربار کا منتظم۔

وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھتا ہوں، اور اس کے بعد بارہ امام کو اپنا پیشوا جانتا ہوں اور آئین میری یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور حج بھی کر آیا ہوں، اور اپنے مال سے خمس زکوٰۃ دیتا ہوں اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ لیکن ظاہر میں یہ سارے عیب جو مجھ میں بھرے ہیں جن کے سبب سے آپ ناخوش ہوئے ہیں اور تمام خلق اللہ میں بدنام ہو رہا ہوں، اس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند سگ پرست مشہور ہوں اور مضاعف محصول دیتا ہوں یہ سب قبول کیا ہے، پر دل کا بھید کسو سے نہیں کہا۔ اس بہانے سے میرا غصہ زیادہ ہوا اور کہا مجھے تو باتوں میں پھسلاتا ہے، میں نہیں ماننے کا جب تلک اس اپنی گمراہی کی دلیل مفصل عرض نہ کرے کہ میرے دل نشین ہو، تب تو جان سے بچے گا نہیں تو اس کے قصاص میں تیرا پیٹ چاک کراؤں گا، تو سب کو عبرت ہو کہ بار دیگر کوئی دین محمدی میں رخنہ نہ کرے۔

خواجہ نے کہا، اے بادشاہ! مجھ کم بخت کے خون سے درگذر، اور جتنا مال میرا ہے کہ گنتی اور شمار سے باہر ہے سب کو ضبط کرے، اور مجھے اور میرے بیٹے کو اپنے تخت کے تصدق کر کر چھوڑ دے اور جان بخشی کر۔ میں نے تبسم کر کے کہا، اے بے وقوف! اپنے مال کی طمع مجھے دکھاتا ہے سوائے سچ بولنے کے اب تیری مخلصی نہیں۔ یہ سنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے، اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بولا، میں تو بادشاہ کے روبرو گنہ گار ٹھہرا مارا جاؤں گا، اب کیا کروں؟ تجھے کس کو سونپوں؟ میں نے ڈانٹا کہ اے

مکّار، بس اب عذر بہت کئے، جو کہنا ہے جلدی کہہ۔

تب تو اس مرد نے قدم بڑھا کر تخت کے پاس آکر پائے کو بوسہ دیا اور صفت و ثنا کرنے لگا اور بولا، اے شہنشاہ! اگر حکم قتل کا میرے حق میں نہ ہوتا تو سب سیاستیں سہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا۔ لیکن جان سب سے عزیز ہے، کوئی آپ سے کنوئیں میں نہیں گرتا۔ پس جان کی محافظت واجب ہے، اور ترک واجب کا خلاف حکم خدا کے ہے۔ خیر جو مرضی مبارک یہی ہے تو سرگذشت اس پیر ضعیف کی سنیے۔ پہلے حکم ہو کہ وہ دونوں قفس جن میں دو آدمی قید ہیں حضور میں لا کر رکھیں۔ میں اپنا احوال کہتا ہوں، اگر کہیں جھوٹ کہوں تو ان سے پوچھ کر مجھے قائل کیجئے اور انصاف فرمایئے۔

جان عالم کی شادی انجمن آرا کے ساتھ

(مرزا رجب علی بیگ سرور)

کدھر ہے تو اے ساقی گل عذار | مرا غم سے دل ہو گیا خار خار
پلادے کوئی ساغر لالہ رنگ | جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ
کہے کتنے صحرانوردی کے رنج | بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

سرود سرایان بزم شادی و نغمہ پردازان محفل عروسی و دامادی انجمن بیان میں یوں زمزمہ سنج ہوئے ہیں کہ جب جلسۂ عیش و طرب سے فرصت سب کو ہوئی ایک روز بادشاہ جم جاہ محل سرائے خاص میں جلوہ بخش تھا بی بی سے خلوت میں فرمایا کہ حقوق اور احسان جیسے جان عالم کے ہمارے ذمہ ہمت ہیں تمام عالم جانتا ہے اور یہ بھی نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشق انجمن آرا میں نادیدہ مبتلا ہو سلطنت کھو یہاں آیا ہے اور کس مردانگی سے جادوگر کو مارا اور اس کے پھندے سے چھڑایا ہے اس کے قطع نظر صورت سیرت خلق و مروت ہمت و جرأت یہ جتنی صفتیں ہیں سب خالق نے عطا کی ہیں حسب عالی نسب والا حسن میں مہر و ماہ سے نرالا مناسب کیا ضرورت ہے کہ جلد سامان شادی درست کر منعقد کرو خدا جانے آج کیا ہے کل کیا ہو گا۔ کار امروز بفردا مگذار، اس نے عرض کی

جو رائے اقدس میں گذرا یہی میرا مطلب عین تھا۔ بادشاہ نے فرمایا آج انجمن آرا سے یہ مقدمہ اظہار کرکے جواب باصواب حاصل کرلو۔ کل سے سرگرم سامان شادی ہو۔ یہ کہہ کے بادشاہ دیوان عام میں رونق افزا ہوا انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا اور دو چار مغلانیاں آتونیں سن رسیدہ محل دار یں جہاں دیدہ قدیم جو تھیں انھیں بلوایا شہزادی کی جلیسیں بھی یہ سن کر بے بلائے آئیں۔ اس نے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا پیار کیا پھر کہا سُنو پیاری دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک بیٹی کسی کی ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان ہر وقت رنج کا نشان خفّت کا سامان ہے اور خدا و رسول کا حکم بھی یہی ہے کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو شادی کردو۔ ورائے ان باتوں کے ایک شخص نے تمھارے واسطے گھر بار چھوڑا سلطنت سے ہاتھ اٹھا کسی آفت سے منہ نہ موڑا جی پر کھیل گیا کیا کیا بلائیں جھیل گیا سر کھپی اور جان جوکھوں کی جب تم نے ہم کو دیکھا۔ ہم نے تمھاری صورت دیکھی شکل میں پری شمائل فرخندہ خو فرشتہ خصائل تمام شہر عاشق زار ہے چھوٹا بڑا اس پر فریفتہ اور نثار ہے۔ ہر چند تم پارۂ جگر نور نظر ہو مگر واری جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اس میں بڑا فرق ہے۔ تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے وہ مرد میداں نبرد ہے۔ رنڈی مرد کا بہت تفاوت مشہور ہے آگاہ نادان و ذی شعور ہے اِلّا جانی ہمارا کہنا آرسی مصحف میں نظر پڑے گا دیکھے گا جو دکھائی دے گا۔ انجمن آرا نے یہ سن کر سر جھکا لیا رونے لگی کہا حضرت صورت شکل کا یہاں مذکور کیا ضرور تھا یہ اللہ کی قدرت ہے کسی کو بنایا کسی کو بگاڑا۔ بہت سے لولے لنگڑے کانے کھدرے گونگے بہرے ہیں وہ

چاہے نہ جئیں۔ کہیں نور ہے کہیں نار ہے گل کے پہلو میں خار ہے یہ سب صنعت پروردگار ہے۔ دنیا میں کون سی شے بے کار ہے۔ بُروں سے اچھوں کی تمیز ہے یوں تو بادشاہ مصر غلام عزیز ہے اور جو بار احسان سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کرو تو دنیا عالم اسباب ہے ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شخص نہ آتا اور میرے مقدر میں رہائی ہوتی کچھ ایسا سامان نکل آتا اور کوئی اللہ کا ولی پیدا ہو جاتا میرے بند چھڑاتا۔ لمؤلفہ

نیک و بد زمانہ نہیں اختیار میں

ہوتا وہی سرور ہے جو سرنوشت ہو

میری قسمت کم بخت بُری تھی۔ ایک مصیبت سے چھڑا دوسری آفت میں پھنسایا۔ ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا خدا جانے وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے، اپنے منہ سے میاں مٹھو شہزادہ بنایا ہے آپ کی لونڈی ہوں بہرصورت فرماں بردار اگر کنوئیں میں جھونک دو چاہ سے گر پڑوں اُف نہ کروں مگر جو آپ اس کی تشکل پر رنج محنت و مشقت کو سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں۔ اگر مزدوری کی اُجرت خدمت کا انعام منظور ہے کہ بادشاہوں کے نزدیک احسان کسی کا اٹھانا بہت دور ہے تو روپیہ اشرفی جاگیر عنایت کرو اُس کا بھلا ہو کام ہو آپ کا نام ہو یہ فقرہ سن کے وہ بہت ہنسی کہا شاباش۔ بچی اُس کی جاں فشانی کی خوب قدردانی کی واقعی۔ وہ بے چارہ تمہارے ملک کا یا روپے پیسے کا محتاج ہے؟ اری نادان! وہ تو خود صاحب تخت و تاج ہے اس بات پر ہم سبوں نے قہقہہ مارا کہا حضور بس ان کا یہ شعور ہے۔ ان کے نزدیک وہ شہزادہ نہیں مزدور ہے۔ انجمن آرا

نے جھنجھلا کر کہا کہ روپیہ وہ شے ہے کہ اس کے واسطے اسفندیار سا
روئیں تن مارا گیا۔ فریدوں وافراسیاب کا سر اُتارا گیا۔ وہ جو دائی دوا آتون
مغلانیاں پرانی پرانیاں حاضر تھیں بولیں قربان جائیں واری ماں باپ کی
عدول حکمی میں خدا و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے تمھیں انکار مناسب نہیں۔
اور خدا نخواستہ یہ کیا تمھاری دشمن ہیں جو راہ چلتے کے حوالے کسی
کے کہے سننے سے بے دیکھے بھالے کر دیں گی۔ آدمی روز بروز عقل و
شعور سیکھتا ہے نشیب و فراز بات کا محل و موقع سوچتا سمجھتا ہے تم سلامتی
سے ابھی تک وہی بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔ کھیلنے کودنے کے سوا قدم نہیں
دھرتی ہو۔ انجمن آرا نے جواب نہ دیا سر زانو پر رکھ لیا لیکن وہ جو امیرزادیاں
اس کی ہم نشینیں جلیسیں تھیں جن سے اس بات کے روز مشورے رہتے
تھے بولیں، ہے ہے لوگو تمھیں کیا ہوا ہے۔ آتون جی صاحب بے ادبی
معاف۔ آپ نے دھوپ میں جونڈا سفید کیا ہے خیر ہے صاحبو دلھن سے
صاف صاف کہوایا چاہتے ہو دنیا کی شرم و حیا نگوڑی کیا اڑ گئی اتنا تو سمجھو
بھلا ماں باپ کا فرماں کسی نے ٹالا ہے جو یہ نہ مانیں گی 'الخاموشی نیم رضا'۔
بوڑھے بڑوں کے روبرو اور کہنا کیا یہ سن کے آتون قدیم جس نے
انجمن آرا کو پالا پڑھایا لکھایا تھا اس نے مبارک باد کہہ کے انجمن آرا
کی ماں کو نذر دی محل میں قہقہے مچے شہزادی بناوٹ سے رونے لگی۔
نواب ناظر بیگم کی نذر لے کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا نذر دی خلعت
مرحمت ہوا۔ یہاں تو ارکانِ سلطنت اسی دن کے روز منتظر رہتے تھے۔
یہ مژدۂ فرحت افزا دریافت کر کے اٹھے بہ مراتب نذریں گذریں توپ
خانوں میں شلک کا حکم پہنچا۔ نوبت خانوں میں شادیانے بجنے لگے مبارک سلامت

کی صدا زمین و آسمان سے پیدا ہوئی - **شعر**

فلک پر یہ مبارک باد ہے اب کس کے ملنے کی
یہ ایسا کون بختاور ہے جس کا بخت جاگا ہے

بادشاہ نے وزیر اعظم سے ارشاد کیا جان عالم یہاں مسافرانہ وارد ہے تم امورات محل میں مستعد رہو ہم اس کا سامان سرانجام کریں۔ وزیر آداب بجالایا خلعت فاخرہ ملا، ہاتھی پالکی سے سرفراز ہوا جان عالم کا یہ نقشہ تھا چہرے پر بشاشت سے سرخی باچھیں تابناگوش کھلیں فرحت کے باعث بند قبا لوٹے جاتے تھے مگر شرم کے باعث آپ سر نہ اُٹھاتے تھے۔ بادشاہ نے رمّال نجومی جفر داں جو جو ہیئت اور ہندسہ اور نجوم میں طاق شہرۂ آفاق تھے طلب کئے اور ساعت سعید کا سوال کیا۔ کسی نے قرعہ پھینکا زائچہ کھینچا شکلیں لکھیں کسی نے پوتھی کھولی کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا کوئی تلا برچھک دھن، مکر، کمبھ، مین، میکھ، برکھ، متھن، کرک، سنگھ، کنیاں، گنگر، بچار کرنے لگا کوئی مشتری، مریخ، شمس زہرہ، عطارد، قمر، زحل کا حال مع گردش برج کمہ کے حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، قوس، عقرب، جدی، دلو، حوت، میزان کی میزان دے کر شمار کرنے لگا کہا بعد مدت قمر اور مشتری کا بہ طرز خلاف حمل میں قران ہے۔ اس ہفتے کا دن رات سعد اکبر ہے اور باتفاق ایک روز مقرر کیا۔ حضور سے بقدر علم و کمال خلعت اور انعام عنایت ہوا اور بعد جلسہ شادی بامید دیگر و امداد و افرا امید دار کیا۔ القصہ بموجب احکام اختر شناسان بلند بیں فلک سیر، ماضی مستقبل حال داں باریک خیال اور منجمان صدر نشین مسند گنشت و دیر حکم روایان خوش فال مانجھے کا جوڑا دلھن کے گھر سے چلا مزدور سے

تا فیل نشیں زن و مرد فرد فرد با لباس رنگیں پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے سنہرے خوانوں میں پینڈیاں مقوی مفرح ذائقہ ٹیکا خوان تک بسا اور دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے طلائی چوکی جواہر جڑا زمرد نگار کٹورا ابٹنا ملنے کا کنگنا بہ از عقد ثریا در یکتا بڑا بڑا لنگی ملتان کی تھی بیل بوٹے میں گلستان کی تھی ابٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پر خندہ زن ہو معطر دماغ انجمن ہو کنٹروں میں عطر سہاگ مہک پری ایجاد نصیر الدین حیدری ارگجہ محمد شاہی فتنے کی بو چار سو زعفران کا سا تختہ کھلا کوسوں تک خوان سے خوان ملا نوبت نشان گھوڑوں پر شہنا نواز نقارچی جوان سکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں ان کے بناؤ کی تیاریاں کہاریاں پری جسم برق درخشاں کا عالم باہم قدم قدم اس سامان سے وہ سب مانجھا لے کے در دولت نوشاہ پر جو بس گئے، شہر کے کوچہ و بازار بس گئے۔ وہاں دولھا نے یہاں دلھن نے مانجھے کے جوڑے پہنے۔منادی نے ندا کی جو سفید پوش نظر آئے گا اپنے خون سے سرخ ہو گا یعنی گردن مارا جائے گا بادشاہ نے خود ملبوس خاص رنگیں زیب جسم کیا رنگ کھیلنے لگا تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی۔شہر میں شہاب اور زعفران کے سرخ و زرد نالے بہے۔گلیوں میں عبیر گلال کے ٹیلے، ٹیکرے رہے کوچہ ہر بازار کا زعفران زار کشمیر تھا۔ایک رنگ میں ڈوبا امیر و فقیر تھا۔بہ تاکید تمام خاص و عام کو حکم ہوا کہ آج سے چوتھی تک سوائے اہل حرفہ اپنے امور ضروری موقوف کر گھروں میں ناچ دیکھو جشن کرو جو کچھ احتیاج ہو سرکار سے لو اور ہر رئیس محلہ اور سردار قوم سے فرمایا جو جو تم سے متعلق ہوں ان کی فرد درست کر حضور میں گزرانو ان کے کھانے پینے کا سامان خواہ ہندو ہو یا مسلمان

حضور سے ملے گا اور اربابِ نشاط کے داروغہ کو حکم ملا کہ جس کی جیسی
لیاقت ہو یا جس کا جو شائق ہو بشرطیکہ اس کے لائق ہو بہ رضا مندی
طرفین وہ ویسا طائفہ وہاں بھیج دو۔ دکان داروں کو ارشاد ہوا دن رات
دکانیں کھلی رہیں۔ قریب قریب ناچ ہو۔ دن کے کھانے کا صرف تصرفی
باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندوؤں کو پوری کچوری مٹھائی اچار مسلمانوں
کو پلاؤ قلیہ زردہ قورمہ ایک آبی دوسری شیرمال فرنی کا خوانچہ تشتری
کباب کی بہت آب و تاب کی۔ شہر میں گلی گلی عیش و نشاط خوشی ہیں۔
چھوٹے بڑے سب نہ کسی کو کسی سے غرض نہ مطلب، پکا پکایا کھانا کھانا
دوکانوں پر بیٹھے ہر وقت ناچ دیکھنا سرکار کا کام بنانا بغلیں بجانا۔ بیت

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

اور اس سے پہلے بہ تعین تاریخ و روز شادی نامے بادشاہوں کو فرمان
راجہ بابو کو، صوبہ داروں کو شقے، عاملوں کو پروانے جا چکے تھے دو چار
منزل گرد و پیش سر راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور
حلوائی کھانا مٹھائی گرما گرم تیار کئے رہتے تھے کہ اس عرصے میں جو
مسافر گزرے یا طلبیدۂ بادشاہ آئے بھوکا نہ جائے اور مژدۂ شادی راہ
چلتوں کو سنا شہر میں۔ بھیج دیتے تھے کہ جلسہ قابل دید ہے۔ غرض کہ دو منزل
چار منزل بلکہ دس بیس دن کی راہ سے تماش بین بے فکرے لکھنؤ والوں
سے سیر دیکھنے آئے اور ساچق کا دن آیا۔ اگر سب سامان بیان کروں
کہانی ناتمام رہ جائے وہی مشتے نمونہ از خروارے پچاس ہزار جوگھڑے
روپہلے سنہرے جواہر نگار، نقل اور میوے سے لبالب لاکھ خوان

بہ حُسن و خوبی بسیار پُر تکلف سب پچاس ہزار میں مصری کے کوزے باقی
میں میوہ اور قند کی چھڑیاں مرصع کاری کی بڑی تیاری کی۔نقرئی دہی
کی مٹکی گلے میں مچھلیاں ناڑے سے بندھیں۔آرائش کے تخت بے حساب
اس روش کے جن کے دیکھنے سے صنّاعی صانع حقیقی کی یاد آئے گل بوٹا
اس سج دھج کا جو نقل کو اصل کر دکھائے۔آتش بازی کے ٹوکرے قطار
در قطار بے پایاں سرو جھاڑ درخت میوہ دار ہزار در ہزار لا بیان۔بہت
تزک بڑا سامان آرائش کے گل دستوں سے چمن رواں ساتھ تھا ہر دست
بہ باغ ہاتھوں ہاتھ تھا۔اس انداز سے ساچق گئی۔مہندی کی شب ہوئی
وزیر درست تدبیر نے خوب تیّاری کی۔نارنول کی مہندی ہزارہا من بو باس
میں دلھن پن، رنگین جس کی دید سے ہاتھ مثل پنجۂ مرجان رشک عقیق یمن
اور لعل بدخشاں ہو جائے۔ایک بار لگائے لال ہو تمام عمر کف افسوس ملتا
رہے۔نہ ہاتھ لگنے کا ایسا ملال ہو۔جڑاؤ سینیوں میں حنا شمع مومی و کافوری
اس پر روشن بلیدے کے خوانوں پر جوبن آرائش و آتش بازی ہم راہ
سب کے لب پر واہ واہ بہت چمک دمک سے مہندی لایا اور یہ
رنگ ڈھنگ حسن تدبیر سے دکھایا کہ تمام ہم چشموں میں سرخ رو ہوا۔برات
کی رات کا حال سنو۔دیوان خاص سے دلھن کا مکان پانچ کوس تھا
یہاں سے وہاں تک دونوں طرف بلّور کے جھاڑ آدمی کے قد سے دو چند
سو سو بتی کے سر بلند پانچ چھ گز کے فاصلے سے روشن اور دس گز جدا
نقرئی طلائی پنج شاخا جلتا ان سے کچھ دور ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر
روشنی کرتے جھاڑ رشک سرو چراغاں چمکتے جا بجا ترپولئے اور نوبت خانے
بنے۔کنکھ انھک ان پہ ناچتے۔نوبت بجتی۔مغرق شامیانے تنے۔اس کے

قریب دو رویہ آتش بازی گڑی۔ روشنی یہ روشن تھی کہ چیونٹی، سوار کو بہ ہیئت مجموعی مفصل معلوم ہوتی تھی۔ غرض کہ دولھا سوار ہوا شور و غل یک بار ہوا۔ کسی نے کہا سواری جلد لانا کوئی ٹیکا شملہ سنبھال کر پکارا خدمت گار کو بلانا۔ پلٹنیں آگے بڑھیں باجے بجنے لگے کوس دکورگرجنے لگے نوبت نشان ماہی مراتب جلوس کا سامان سواروں کے رسالے دورویہ باگیں سنبھالے خود اپنے اس کے آگے بیش قرار درماہے دار پھر ہزار بارہ سو تخت رواں تمامی سے منڈھا ان پر رنڈیاں جوان جوان شادی مبارک گائیں، سج دھج دکھا طبلے بھڑ بھڑائیں۔ بہت سے سانڈنی سوار تیز رفتار خاص بردار خاصیاں کندھوں پر دولھا کے قریب۔ برچھی والے بانداز چوب دار۔ روشن چوکی والے شہنائیاں پر تکلف سُر ملانے ہزاروں غلام زرّین کمر سنہری روپہلی انگیٹھیاں ہاتھوں میں جھولی میں عنبر سارا عود غرقی بھرا دشت مہکتا گرد ہزار ہا پنج شاخا جھمکتا سونے چاندی کی دستیاں روشن، جلو میں چالیس پادشاہ پر شوکت و جاہ پیچھے بارہ ہزار ہاتھیوں پر امیر وزیر ارکان سلطنت ترقی خواہ، خواصی میں انجمن آرا کا بھائی جان عالم کا سالا بجائے شہ بالا، آہستہ آہستہ قدم قدم خوش و خرم چلے۔ کوچہ و بازار بوباس سے معطّر تھا چرخ گرداں اس تماشے کو بہ چشم انجم نگراں تھا۔ دشت کا وحش و طیر حیران تھا پہر رات رہے دلھن کے دروازے پر پہونچے۔ ماما اصیلیں دوڑیں پانی کا طشت ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا۔ کسی نے کچھ اور ٹوٹکا کیا دولھا اتر کر مجلس میں داخل ہوا۔ بارہ سے طائفہ رنڈیوں کا سوائے بھانڈ بھگتیے، ہیجڑے، زنانے کشمیری قوال، بین کار، ربابیے، سردوئے کے حاضر تھا ناچ ہونے لگا

قریب صبح قاضی طلب ہوا۔ بہ ساعت معیّن کئی سلطنت کے خراج پر مہر بندِ طالب و مطلوب کو سلک ازدواج میں منسلک کیا مبارک سلامت کا غل مچا۔ میر سوزؔ

فلکِ شب کتخدائی دیکھ اس کی سوز یوں بولا
تجھے یہ رات اے رشکِ مہِ انور مبارک ہو!

ادبی خطوط غالب

(۱)
مولوی عبدالرزاق خاں شاکر کے نام

پیر و مرشد! مصرع "اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے۔ مصرع "ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش، یعنے اندھیرا ہی اندھیرا۔ ظلمت غلیظ۔ سحر ناپید، گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں دلیل صبح کی بود رہے ہے تو بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔

لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہئے، جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

متقابل ہے مقابل میرا   رک گیا دیکھ روانی میری

تقابل و تضاد کون نہ جانے گا۔ "نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج وجود و عدم۔" لفظ متقابل اس مصرعے میں بہ معنی مرجع ہے۔ جیسے حریف کہ بہ معنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روے خود عادت ضد ہم دگر ہیں۔ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا۔

غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں اور میں اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں۔ والسلام۔

(۲)

سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام

حضرت! آپ کے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ، دوسری طرف اگر کچھ لکھا جائے تو میری تحریر ایک طرف، تم خود اپنی عبارت کو درست نہ پڑھ سکو گے۔ ناچار جداگانہ ورق پر سوالات کا جواب لکھتا ہوں۔

۱۔ رنگ بوزن سنگ، ترجمہ لون اور لفظ فارسی الاصل ہے۔ جب اس کو اُردو میں منصرف یا بقول بعضے متصرف کریں گے تو نون کا تلفظ موہوم سا ہو کر رہ جائے گا۔ رنگنا (بروزن ''چند جا'' یعنی باعلان نون) نہ کہیں گے بلکہ وہ لہجہ اور ہے جیسا کہ مصرعے ہیں۔ ع ہم نے کپڑے رنگے ہیں شنگرفی — یہ صحیح ہے اور فصیح ہے۔ ع ہم نے رنگے (باعلان نون) ہیں، کپڑے شنگرفی — گنواری بولی غیر صحیح اور غیر فصیح ہے۔

۲۔ خرام کو کون مؤنث بولے گا مگر وہ کہ دعوائے فصاحت سے ہاتھ دھوئے گا۔ رفتار مؤنث اور خرام مذکر ہے۔ رفتار کی تانیث کو سند ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔

۳۔ حروف مسروری جن کو ثنائی بھی کہتے ہیں، موحدہ سے زائے معجمہ تک الف کی جگہ تحتانی بھی قبول کرتے ہیں۔ مولوی آل نبی سہارن پوری اور مولوی امام بخش دہلوی میں اس بات پر جھگڑا ہوا۔ مولوی امام بخش ''یا'' کو ''یے'' کہنا جائز نہیں رکھتے تھے۔ آخر مولوی آل نبی نے آئمہ

فن کلام کے کلام سے اس کا جواز ثابت کردیا مگر صرف از روئے تلفظ " اور اس کی اجازت"۔ کوئی قاعدہ خاص اس کے واسطے نہیں۔ اردو میں "طا" کو "طوئے" اور "ظا" کو "ظوئے"، کہتے ہیں اور باقی حروف کے آخر میں تحتانی بولتے ہیں۔ لسان عرب و عجم میں موحدہ سے زائے معجمہ تک اور آخر حروف میں الف بھی لاتے ہیں اور تحتانی بھی۔ طا، ظا، کو طا، ظا ہی کہیں گے نہ طوئے، نہ ظوئے، نہ طے، نہ ظے، علی ہذا القیاس حروف باقیہ۔

راقم اسد اللہ خاں

(۳)

۱۔ تیئں کا لفظ متروک اور مردود و قبیح غیر فصیح۔ یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل جو ہمارے ہاں نوکر رہتی تھی، بولا کرتی تھی، تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں۔

۲۔ طیار صیغۂ مبالغہ ہے۔ لغت عربی۔ املا اس کی طائے حطی سے۔ طَیر مادہ۔ طائر اسم فاعل۔ طیور جمع۔ بازداروں میں اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی۔ طوئے، تے بن گئی۔ یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ "فلاں باز فلاں شکرہ طیار شدہ است" بہرحال اب تائے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا۔ اس لفظ کو متحدث اور دراصل اردو اور بہ معنی آمادہ، اشخاص و اشیا پر عام تصور کرنا چاہیے اور عبارت فارسی میں

اس کا استعمال کبھی جائز نہ ہوگا۔

۳۔ فقیر کے نزدیک نقاب اور قلم اور دہی یہ تینوں اسم مذکر ہیں۔ منکر سے مجھے بحث نہیں۔ مجیب[1] کا یں احسان مند نہیں۔ لغت فارسی ہو اور روزمرہ فارسی ہو تو اہل زبان کے کلام سے استناد کریں۔ منطق فارسی میں تذکیر و تانیث کہاں۔ پس اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں اور یہ "ہم" صیغہ متکلم مع الغیر[2] ہے۔ یعنی ہم اور تم اور جمیع شرفا اور شعرائے دہلی و لکھنؤ۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ۔

بنائیں قدر کی غزلیں جناب غالب نے   تمام جوہر تیغ زباں اُبھر آئے

غزل کی "ز" یہاں ساکن ہے۔ لیکن یہ سکون جائز ہے (جیسے) قدم مفرد، قدموں جمع ہے۔

۴۔ فریاد مؤنث ہے۔ فریاد کرنی چاہیے صحیح۔ فریاد کرنا چاہیے غلط۔

۵۔ فکر مؤنث ہے۔ معشوق کو ہم زاد بنانا، ظرفا کو اپنے اوپر ہنسانا ہے۔

۶۔ لگا دیتے ہو اور اٹھا دیتے ہو خطاب جمع حاضر ہے اور تعظیماً مفرد آتا ہے یعنی تم۔ معشوق مجازی کو تم اور تو دونوں طرح یاد کرتے ہیں۔ خدا کو یا "تو" کہتے ہیں یا صیغہ جمع غائب کا جو نظر بہ قرینہ افادہ قضا و قدر کا رکھتا ہے۔ تمھاری غزل میں دو چار جگہ "دیتے ہو" اس طرح آیا ہے کہ محبوب مجازی اس سے کبھی مراد نہیں ہو سکتا۔

---

[1] قبول کرنے والا [2] یعنی جمع متکلم۔

لا کے دنیا میں ہمیں زہر فنا دیتے ہو   ہائے! اس بھول بھلیاں میں دغا دیتے ہو
کہو کس سے کہتے ہو ؟ سوائے قضا و قدر کے کوئی اس کا مخاطب نہیں ہو سکتا اور علیٰ ہذا القیاس دو ایک اور بھی۔ ناچار صیغہ جمع غائب رکھ دیا کہ خواہاں اور بتاں کی طرف ضمیر راجع ہو۔ یا شخص واحد کی طرف اب کے لفظ کے ساتھ، یا قضا و قدر کی طرف۔ اب خطاب معشوقان مجازی اور قضا و قدر میں مشترک رہا۔

۷۔ س۔ پناہ کا ترجمہ لغت اردو میں کیا آیا ہے ؟

ج۔ اردو مرکب ہے فارسی اور ہندی سے۔ یعنی پناہ کا لفظ مشترک ہے اردو میں اور فارسی میں۔ پناہ کا ترجمہ اردو میں پوچھنا نادانی ہے۔ ہاں پناہ کی ہندی آسرا ہے۔

۸۔ " بر نہ آنا " فصیح " نہ بر آنا " ٹکسال باہر۔ قافیہ ہائے اصلی الفیہ سیکڑوں ہیں۔ ان کو چھوڑ کر نسخہ اور نامہ اور افسانہ، ان کو قافیہ کرنا، تمھارے نزدیک نامناسب نہیں ؟ ایسا قافیہ غزل میں ایک جگہ لکھو۔

غالب

(۴)

منشی وداد خاں سیّاح کے نام

منشی صاحب! تمھارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں اور مطالب مستفسرہ کا جواب لکھتا ہوں اور اپنے دوست روحانی مرزا رجب علی

بیگ سرورؔ کو سلام کہتا ہوں ۔ کہہ دیجئے گا بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجئے گا۔

پر بہ معنی لیکن لفظ مشہور ہے اور پہ اس کا مخفف ہے، اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو، کوئی لکھے یا نہ لکھے، میرے اردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔

مجھ کو بنگالے سے آئے ہوئے ۳۲، ۳۳ برس ہو گئے، بہت احباب مر گئے، بہت متفرق ہو گئے، اب ایسا وہاں کوئی نہیں جس سے ارسال رسائل کی رسم وراہ ہو ۔ صاحب! وہ شعر جس کو تم نے پوچھا ہے، یہ ہے ؎

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آ گئے ہیں، وہ دوسرے صفحے پر لکھتا ہوں ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ! ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دیکھو یہ پر کا مخفف پہ ہے بہ معنی لیکن ۔

جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آسکے اس کی تدبیر خاقانی اور فردوسی سے بھی نہ ہوگی ۔ میں کیا کروں گا! نام تمھارا آسکتا ہے لیکن الف دبتا رہتا ہے ۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی پوچھنا۔

نجات کا طالب غالب ۔ سہ شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء

(منشی ہرگوپال تفتہ کے نام)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور

پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا اسلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا:۔

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب   اے تو غائب زنظر، مہر تو ایمان من ست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے تمہاری توجہ مفرط بہ طرف شعر و سخن کے، تمہاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی، یہ جو تمہاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کے

چپ ہو جاتا ہوں :۔

۴۔اے مرگِ ناگہاں ! تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں ۔ جو دُکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں ۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اُن میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو، ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

غالب

پیر و مرشد ۔

فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے ۔ جو حکم آپ کا ہوتا ہے اس کو بجالاتا ہوں، مگر معدوم کو موجود کرنا میری وسعِ قدرت سے باہر ہے ۔ اس زمین میں کہ جس کا آپ نے قافیہ و ردیف لکھا ہے، میں نے کبھی غزل نہیں لکھی ۔ خدا جانے، مولوی دردش حسن صاحب نے کس سے اس زمین کا شعر سن کر میرا کلام گمان کیا ہے ۔ ہرچند میں نے خیال کیا، اس زمین میں میری کوئی غزل نہیں ۔

دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے۔ اپنے حافظے پر اعتماد نہ کرکر اس کو بھی دیکھا، وہ غزل نہ نکلی۔ سنئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دنوں میں ایک صاحب نے مجھے آگرے سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجئے:-

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ اگر یہ کلام میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا:-

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی!

میں نے سن کر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے، خدا کی رحمت، اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ "اسد اور شیر" اور "بت اور خدا" اور "جفا اور وفا" یہ میری طرز گفتار نہیں ہے۔ بھلا ان دو شعروں میں تو "اسد" کا لفظ بھی ہے، وہ شعر میرا کیوں کر سمجھا گیا؟ واللہ، باللہ، وہ شعر "خدنگ" "رنگ" کے قافیے کا میرا نہیں ہے۔ والسلام۔

مرسلہ جمعہ ۲۵ رماہ صیام ۱۲۷۵ھ

و ۲۹ ر اپریل سال حال ۱۸۵۹ء

غالب

رسالہ تہذیب الاخلاق (دو مضمون) ۴۰ نوروز تین صفحے

عبارت: سلیس ۔ سادہ ۔ رواں ۔ با محاورہ ۔ مدلل ۔ سائنٹفک

نوروز

(سر سید احمد خاں)

سوا چار برس بخیریت گذر گئے ۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا ۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہوئے تھے ہو لئے ۔ اب دُم باقی رہ گئی ہے ۔ چاند کی بڑھیا کی کہانی ہے کہ ہاتھی نکل گیا پر دم باقی ہے ۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے ۔ جو کچھ کہ اس سوا چار برس میں ہوا، کیا ایسے قلیل زمانہ میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی ۔ توبہ توبہ! کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں[1] سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی توقع تھی ۔ استغفر اللہ!

وہ عید کا مبارک دن ۔ یعنی یکم شوال ۱۳۰۰ سنہ نبوی اور ۱۲۸۷ ہجری جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا ۔ امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاوے گا ۔ ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں ۔ اس غفلت کی دارو بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا ۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا ۔ دل پتھر ہو گئے تھے ۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا ۔ ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے ۔ زندہ تھے پر مُردوں سے بدتر تھے ۔ اٹھتے ۔ بیٹھتے ۔ چلتے ۔ پھرتے تھے ۔

---

[1] تہذیب الاخلاق کی طرف اشارہ ہے ۔

پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہوگئے۔ وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔ لبوں پر جان ہے۔ پھر اگر جان نہیں تو جہان نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے۔ پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہوجاتے ہیں۔ جب پھر جھنجھوڑو تو ہاں۔ اچھا کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہوجاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور تندخوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے۔ تمہارا کیا اجارہ ہے۔ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے اُن میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے؟ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے۔ وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھ دار بھی ہوجاویں گے۔ یہی رست وخیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی۔ اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہئے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لے گا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔

کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے ؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے ۔ کیا نیچر کا قافیہ کیچڑ کہتے ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے (معاف کیجئے ان ضدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے ۔ کیا چاردانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب ۔ سولزیشن، سولزیشن ۔ قومی ہمدردی ۔ پیٹریاٹزم پیٹریاٹزم کا غلغلہ نہیں ہے ۔ کوئی اخبار اٹھاؤ اس میں ۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو ۔ جس گلی کوچہ میں جاؤ سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سن لو ۔ مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ ۔ مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ ۔ برا کہو خواہ بھلا کہو ۔ مگر ہم دعا گوؤں کو مت بھولو ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے ۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ کسی کی کیا رائے ہے اور کسی کی کیا ۔ کیوں کہ جو بات ٹھیک نہیں ہے وہ آج نہیں کل ، کل نہیں پرسوں سب کو معلوم ہو جاوے گی اور سب اسی پر یقین کریں گے اور اسی پر متفق ہوں گے ۔ ضرور ایک دن آوے گا جو قوم کہے گی کہ ہاں سید احمد بھی کوئی دیوانہ تھا ۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا ۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو ، تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا اور اس کی مراد پوری ہو گئی ۔

مگر ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں، کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سولائزڈ یعنی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیے۔ دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ بایں ہمہ وہ لوگ اِس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن و محب قوم ہیں۔

ترقی علم انشا

(جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں

اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفےٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا، سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے) ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ وسلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور

جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں ان سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے ان ہی کو پھر کے جاتے ہیں۔ یہ نقص اسی وقت رفع ہو گا جب کہ انواع و اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہو گی۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے

نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو گی ہو۔ میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، جو اس سے زیادہ فصیح و دل چسپ با محاورہ نہ ہو گی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے واڈیسن کی سی ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہیے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے

Imp

Imp

new words

لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر پر عقیق دیاقوت و زمرد کی پچکاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہوسکتی اور نہ سب اہل زبان سے، بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیے کہ اہل زبان کے لفظوں کے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے متعلق ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اسی ملک کی زبان میں قایم رکھے کیوں کہ اگر ان کے لئے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہوجاوے گی۔ ٹونس میں جو تاریخیں غیر ملکوں کی عربی زبان میں ترجمہ تھیں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھو کہ کس قدر غیر زبان کے الفاظ معرب و غیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی اخبار الجوائب کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہوجاتے تو وہ زبان بھی مثل عبرانی و سنسکرت و ژند کے مردہ زبان ہوجاتی۔

علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہوتا ہے کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی

الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر کسی کو بشرغس نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کرے گا۔ عربی زبان سے کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔

پوچھو کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال نہ پیدا کرے۔

لٹریچر یعنی علم ادب اہل زبان کے لئے نہایت وسیع جولان گاہ ہے۔ اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے ان ہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے اور کبھی رولا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے۔ کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے۔ کبھی ترکیب جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے۔ اور اس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزہ رکھتا جاتا ہے۔ اگر وہی چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے

تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے ۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے اور غیر اہلِ زبان وہ چال چلے تو غلط ہے ۔ نہیں در حقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس کا بولنا غلط ہوتا ہے اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے ۔

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لئے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے ۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اس مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی ۔ مثلاً بعضے اہل زبان تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جس کی مناسبت کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔ اگر وہ اس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے ۔ اس لئے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہو گیا ہے ۔ اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کے حسب و نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے ۔ شیخ ۔ سید ۔ مغل ۔ پٹھان ہے اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا مگر اس لفظ کے بولنے والا اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے ۔ وہ اِس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں ، تعلیم میں ، حیثیت میں ، اطوار میں افضل ہو ۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کا چال چلن اچھا ہو ۔ نیک اور خوش اخلاق ہو ۔ وہ ہر بات میں جو اس سے متعلق ہو حلیم ہو ۔ چال چلن میں حوصلہ و مزاج میں ، خواہش

اور ارادہ میں سلیم ہو۔ ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور پڑھنے کو
گن اور نیک صحبت میں بیٹھنا اس کو پورا کرتا ہے۔ اگرچہ شریف کے بھی
یہی معنی ہونے چاہئیں مگر چونکہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا
ہے تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔ پس ایک محب
قوم اہل زبان ان خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لئے اپنی زبان کو وسعت
دیتا ہے۔ اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے
لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا
ہے۔ اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات
کی ایک کتاب ہو جاوے۔ اسی نمونے سے ہمارے ہم وطن خیال کرسکیں گے
کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے۔ اور ان لغو
خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت پر مرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ
بولتا ہے۔ اپنی واقف کاری انگریزوں کی جتاتا ہے۔ کیوں کہ کسی جنٹلمین
کو ایسے ذلیل خیالات کسی جنٹلمین کی نسبت کرنے زیبا نہیں۔

اردو نظم

ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں
رہا۔ بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم ادب
میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت
عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں
اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین
کو چھونا نہیں چاہیئے تھا۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں۔ اور

جودت طبع اور تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے۔ دوسرے دوسری قسم کے مضامین، جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانہ نے اس کو بھی رفارم کیا اور اہل پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ یاد رہے گا۔

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب اور مسٹر ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اس مشاعرہ کے قائم ہونے پر بڑی توجہ کی ہے، جس کی شکر گزاری ہماری قوم پر واجب ہے۔ ہماری قوم کے لائق و فائق لوگوں نے بھی اس پر بخوبی توجہ کی ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرہ کے بقا اور قیام میں سب سے زیادہ ہمت مصروف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکت الفاظ اور طرز ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثنوی "خواب امن" جو آفتاب پنجاب میں چھپی ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی مناظرہ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہیں درحقیقت ہمارے

زمانہ کے علم ادب میں ایک کارنامہ ہیں۔ ان کی سادگی، الفاظ صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں الفاظ کی ترکیب میں، سادگی وصفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لئے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ اور اس کا بھی تصور ہوسکتا ہے کہ ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی اور ضرور وہ دن آوے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی فرد پر ایسا ہی فخر کریں گے جیسے کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شکسپیئر پر ناز کرتے ہیں مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکا پڑجاتا ہے۔ مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد وہ اندرونی حالت تک بھی پہنچ جاوے گا۔

Imp-

علوم کی بدنصیبی

تمہید

(شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد)

تمام صاحب جوہر اور کل اہل کمال ہمیشہ سے ان نالائقوں اور غلط نما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں، جو فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بیلون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملہ میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحب صنعت پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص و عام کی قدردانی پر منحصر ہے۔ لیکن بنیاد اس کی حکّام یا اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے اسی واسطے اس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حد قلم سے باہر ہے۔ اول تو اہل کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔ ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں ان کی بدنصیبی یہ کہ جن قدردانوں پر مدار کار ہے کبھی کثرت کار

سے، کبھی بے پروائی سے، غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمر مراد آپڑا تو آپڑا۔ نہیں تو ذلت، تباہی اور در بدری کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ان ناگوار باتوں کو غلط نما باکمال گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اصل باکمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں۔ در بدر پھرتے ہیں۔ خوشامدیں کرتے ہیں۔ غرض کہ اس رستے کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ ایک افسانہ کے استعارہ میں بیان ہوتی ہیں

آغاز مطلب

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گذر گئی ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لئے محنت کر رہے ہیں اور جب صدق دل سے جاں فشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہر کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پرواہ نہیں رکھتے وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطان آسمانی کے دربار میں عرضی کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدان خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف و عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔ دربار میں مشتری صدر اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی۔ جب

یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں سب جتائی اور دکھائی گئیں، اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالم خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کارگذاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرت انسان جنھوں نے یہ شوکت و شان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے۔ پھل پھلاری گھاس پات چرتے پھریں گے۔ جنگلوں کے جانور بن جائیں گے، اور جو ان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے، اس کے فیصلے کے لئے عالم بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو اراکین دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے، چنانچہ سب کا اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہئے، ملکۂ کوکب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالم خاکی سے تھا۔ مگر اس کے نور جمال اور حسن کمال نے تمام عالم کو روشن کر رکھا تھا اور صداقت و حقیقت کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکہ علم افروز کا خطاب عطا ہوا۔ اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا۔ جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا۔ اس پر ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان کے تارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اڑایا۔ اس نے بھی عالم میں آکر باپ کی طرف سے وہ شوکت و شان لیاقت دکھائی، جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے اور ماں کی طرف

سے وہ روشنی پھیلائی کہ خاک کا کرہ نور کی قندیل ہوگیا ۔ دن رات دربار جاری تھا ۔ علوم کے مسائل اور ان کی تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے ۔ استاد یعنی صداقت کی طرف سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھیں ۔ چنانچہ علوم و فنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے ۔ وہ ان ہی کے ذریعہ آکر پیش ہوتے تھے ۔

عالم بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے ۔ سب اس کی فرماں روائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ جلوس دربار کے لئے ہر طرح کے سامان بھیجے ۔ اور بارگاہ شاہی نے عجب شان و شکوہ حاصل کی ۔ جب دربار میں آکر بیٹھتی تو عدل و انصاف کھوٹے کھرے کو پرکھنے کو کھڑے رہتے ۔ امید سامنے ناچا کرتی قدردانی دستِ راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارے کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے ۔ ایک دن ملکہ علم افروز اپنے رفعت کے تخت ہوادار پہ سوار ہوکر ہوا کھانے نکلی ۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گذر ہوا ۔ کوہ مذکور پہ جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ دامن کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھٹ رہا تھا ۔ اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اُڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہوگئی ۔ یہاں اگرچہ چھاؤں تھی تو نہ بارش کی سیرابی سے بلکہ گھٹاؤ کے پسینے سے سیل رہی تھی ۔ اب اس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا کچھ پھول تھے تو روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے ، وہ بھی چمک کر رنگ نکال لائے ۔ غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پہ آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا

روئے زمین پر بہار کا یہ عالم دیکھ کر سلطان آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اٹھا دو ۔ عالم بالا کے پاک نہادوں نے گل دستے ہاتھوں میں لے لئے اور خوش ہو کر پھول اچھالنے لگے ۔

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گل زار اور شادابی سے نو بہار دیکھا تو علم تعمیر وہاں آیا اپنے کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گل زار لگایا ۔ طرح طرح کے اوزار کام میں آئے، سڑکیں نکالیں ، اتار چڑھاؤ درست کئے، رلیں جاری کیں، جا بجا فرود گاہیں اور ان میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے ۔ غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لئے سامان بہم پہنچیں ۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی ۔ قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رو رعایت دئے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ امید دروازے پر بیٹھی رہتی تھی اور جن کی علوم و فنون سفارش کرتے تھے انھیں بلالیتی تھی ۔ تمام دربار کثرت خلائق سے بھرا رہتا تھا اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جاتے تھے۔ مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا ۔ کیوں کہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے ان کا نام نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا ۔ پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر پاتو گم نامی

بند اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ نباتات بڑھتے ہیں نہ ان کے پھول کھلتے ہیں نہ پھل لگتے ہیں ۔ سورج کی روشنی اور چلتی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے یہ نہ ہو تو سب ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔

کے گوشے میں بیٹھ جاتے تھے کہ کوئی انھیں پوچھتا نہ تھا۔ یا، ہیچ دلوچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے بعض ایسے بھی ہوتے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہل نظر غباری عینکیں لگالیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے غبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔ ان کے اقبال کا دور آیا ہے۔

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے، نہ شرمندگی کے گوشے میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیئے ہرچند ملکۂ مذکور کا جوہر افلاکی تھا، مگر باپ کی طرف سے پیوند خاکی تھا اس لئے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوئی تھی۔ اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بہت جلد ہوجاتی تھی، مگر پھر بھی حریف جو تاک میں لگے ہوئے تھے، انھیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ اپنے رفیقوں کے گھروں میں کمیٹیاں شروع کردیں اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دئے۔ تمام عالم میں رفاہ عام' اور اصلاح' اصلاح کا نام کرکے فریاد مچا دی جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہوگئی۔ صبح و شام جمع ہوتے۔ لمبی لمبی تقریریں کرتے۔ مگر اس میں مطلب کا نام نہیں، جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے جنھیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا۔ کوئی شمشاد ہو کر رائے شامل کرتا۔ کوئی تائید کرتا، کوئی تسلیم کرتا۔ آپ ہی اتفاق رائے کرلیتے۔ آپ ہی واہ وا کرلیتے۔ اسی تودۂ طوفان کو نکھتے اور پروپیگنڈ

(روئداد) نام رکھتے جسے مشتہر کرکے بڑے فخر کیا کرتے۔

ان ناکاموں کی امید سے راہ تھی اور بے حیائی ان کی بڑی خیرخواہ تھی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف ڈھکیلتی رہتی تھی کہ چلو اور دوبارہ دعویٰ پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جاتے تھے اس پر بھی امید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی اور بے حیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انھوں نے ایک اور رستہ نکالا۔ یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری جو امید کی حمایت اور بے حیائی کی عنایت سے روزافزوں ہے، اس کی کثرت ہمیں ضرور فتح یابی بخشے گی۔ پس جس طرح ہو سکے اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیے۔

جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے تو خواہ مخواہ کے خیرخواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر دیکھو ان کی باتوں میں آکر حقیقت اور واقعیت کو نہ بھول جانا چاہیے۔ خیال کرکے سنو یہ خیرخواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں۔

ادھر تو بے لیاقت اہل فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے ادھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالم خاک میں آکر نیت اس کی پستی کی طرف زیادہ تر مائل ہونے لگی اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئی۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی یا غرور سے دوستی ہو گئی، آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لے لیا اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم و راہ بڑھی کہ اس سے شادی ہو کر دو لڑکیاں بھی

پیدا ہوگئیں ۔ ایک ان میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی خوشامد نے فیاضی سے فیض تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے ۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں ، جن کا اس نے دودھ پیا تھا ۔ دوسری دایہ خودرائی تھی، اس نے پالا تھا ۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خو بو خاوند کی اختیار کر لی ۔ رفتہ رفتہ خودرائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے ۔ صداقت نے جو جو سبق پڑھائے تھے سب بھلا دیئے اور عدل تو بیکار ہی ہو گیا ۔ جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا ۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے ۔ وہ بچارے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے رہتے ۔ ملکہ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا ۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے ، برسوں کی دست کاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے مگر صلہ کے نام خاک بھی نہ پاتے ۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے ، ان کے لئے سب کچھ موجود تھا ۔

جب ارکان سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گذر جائیں تو اہل فساد کیوں نہ سر اٹھائیں ۔

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا ۔ نہ علوم کے قدردان وہاں رہے نہ فنون کے جوہر شناس ، تو چرچے اس کے جا بجا پھیلے اور ان نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں ، جن کی علوم سفارش نہ کرتے تھے ۔ چنانچہ یہ خبریں سن سن کر ان کے ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں ۔ وہ ملکہ کے

دل سے دشمن بدخواہ تھے۔ ان باتوں کو اس کے زوال دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ سرگرم تھے۔ ادھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ امید خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ ادھر بے حیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمن مخفی جو شیطانوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے ملکہ کو ان کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرت انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت
کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں۔ بروں کو بڑھاتے ہیں۔
ویسے ہی اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔

مقام افسوس یہ ہے کہ اب ملکہ کی شان شاہی نہ رہی۔ دکھاوے کی رسموں پر آگئی۔ زبانی خرچ بہت۔ باقی ندارد۔ مبالغے۔ استعارے بلند پروازیاں۔ لفاظیاں حد سے زیادہ مضمون مدعا غائب کتابیں جلدیں کی جلدیں۔ مطلب پڑھو تو ایک حرف نہیں۔ یا تعریف اور خوشامد یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے تزک واحتشام تھے اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی یا باہر ایک ایوان بنوا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا کہ امیدوار وہاں جا کر حاضر ہوا کریں۔ جن لوگوں کو بے حیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی وہ بے روک اس گھر میں چلے جاتے تھے۔ کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آکر بھر گیا۔ ملک ملک سے لوگ چلے آتے تھے اور فقط حماقتوں کے بھروسے پر اس جوش وخروش سے اظہار کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک پر ایک گرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرض مندوں کے خیالات اس سے زیادہ

بگڑ جاتے ہیں، مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرض مندوں پر کیا گذرتی ہے۔

جو لوگ اس دربار میں شریک ہوتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت میں پہنچ لئے، کیوں کہ ان کے لئے بڑا قوی وسیلہ تھا یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقفیت دونوں کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر جا پڑجاتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا اور وہ اپنے دل کی راجہ تھی۔ جب چاہتی تھی کھول لیتی تھی۔ جب چاہتی تھی بند کردیتی تھی۔ غرض کہ بدنصیب غرضی دار اپنی ساری عمر عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے کہ کبھی آس کبھی بے آس۔ ابھی خوش ابھی اُداس۔ اس ایوان کے اندر وسواس داروغہ تھا اور امیدواروں کا یار بنا ہوا تھا۔ وہ دم بدم آتا تھا اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو۔ اور امید کہتی تھی کہ ہاں ہاں، اب حسن قبول کا خلعت دلواتی ہوں۔

ساتھ ہی اس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا۔ اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی رہتی تھی۔ یہ سب اس کی سپردگی میں تھے۔ اور باوجودیکہ اس حال تباہ میں گرفتار تھے مگر بدقسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارت مذکور میں اندھیر چھایا تھا۔ دیوار و در پر الّو بول رہے تھے۔ گرد بدنامی کی چمگادڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں۔ سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں اور پروں سے ایسی خرابی و خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں داغ پڑجاتا

تھا۔

یہ بے ہودہ بے کمال اور نکتہ چین معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی آنکھوں میں چبھتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفات خراب کرتے ہیں۔ حق داروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے مگر نہ اس قدر کہ طوفان نوح کا مقابلہ کر سکے۔

ہر چند جس شخص کے داغ لگتا تھا نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔ مگر خدا جانے بڑھاپا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ بے چاری ہر چند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اس دھبے کو چھپا دے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچا تھا۔ ذرا سا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اڑ جاتا تھا۔ اس سے دھبے اور بھی روشن ہو جاتے تھے۔ اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ اس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے، مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا۔[1]

طوفان بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے چوں کہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں اس لئے اکثر دل کو لے بیٹھے۔ چنانچہ وہ بھی تاک میں لگے رہتے تھے اور جب موقع پاتے کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی۔

---

[1] زمانہ کا ہنر دشمن ہے۔ کیسا ہی اندھیر مچادے۔ مگر خود بخود ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

یعنی منتظر خانہ میں حاضر ہوں ۔ وہاں کوئی ان کی سنتا نہ تھا۔ کیوں کہ ان بے چاروں کو نہ فقط رشک بلکہ وسواس بھی ستاتا ۔ بے حیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے ۔ اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ داغ لگا دو ، اخباروں میں چھاپ دو۔ اشتہار دے دو ۔ سارے جہان میں رسوا کر دو۔ یہ بے چارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے ۔ کسی کی کتاب چھٹ پڑتی تھی ۔ کسی کا عمامہ رہ جاتا تھا ۔ مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے اور جن کے وہ داغ لگا تھا لوگ دور ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ یہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانہ کی ہوا کھا آئے ہیں۔

غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں ۔ کاش کہ وہاں قبول ہو ۔ باقی امیدوار اِس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب خام خیالی اندر آنے کو اشارہ کرے اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں ۔ یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اُسے خوش بھی کرتے تھے۔ مگر نہ فصاحت اصلی یا اشعار واقعی یا خیال عالی سے بلکہ برخلاف اس کے جھوٹی داستانیں ، عاشقانہ افسانے ، زٹلیات ، ڈھکوسلے کہ ان میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی اور اس کے شوہر یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی ۔ کچھ بد دماغی کی چیں بجبیں میں چلے جاتے تھے ۔ بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انھیں خود بھی اُمید نہیں تھی ۔ مگر تخت کے پا انداز میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں

جھٹ گلے میں ڈالیں اور وہیں باندھ دیا کہ ہردم زیر نظر رہو مگر اشاروں پر کام کرو اور اسی طرح زندگی بسر کردو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ اِن زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام لے۔ بلکہ گالیاں بھی دے تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے۔ اس پر خام خیالی جب چاہتی تھی پکڑ لیتی تھی اور زیور ولباس اتار پھر منتظر خانے میں ڈھکیل دیتی تھی۔

یہ لوگ وہاں آکر بھر طوفان بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ وہاں بعض اشخاص جنھیں تجربہ کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا وہ تو کسی اور رستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اور خوش حالی کی راہ ڈھونڈھ لی۔ باقی وہیں پڑے رہے۔ عمر گذارا کیے اور خوشامد کے ذریعہ سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلا آگیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکان مذکور کے بہت سے کمرے تھے۔ ان میں سے ہرایک کو حیثیت کے بموجب بیماری، کاہلی، سستی، شرمندگی، مایوسی کے کمرے میں ڈال دیا۔ کہ وہاں وعدے اور وعدہ شکنی، خوشی، اور ناخوشی، امید اور ناامیدی میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ اور آخر ملک عدم کو چلے جائیں۔

دیکھو صبح کے رستے بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں۔

علوم وفنون نے بھی بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزت نہیں بلکہ بے عزتی ہے۔ ملکہ کے محل سے نکلے۔ تمام دنیا میں پھرے۔ تکلیف ومصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔ اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گذر ہوا۔ ایک بہتے چشمے کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان

اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں ۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی ہے۔ وہ تحمل کی بیٹی تھی اور قناعت کی گود میں پلی تھی ۔ چنانچہ سب سے الگ اس گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی تھی اور کنج عافیت اس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقام علوم وفنون کو بھی گذران کے قابل معلوم ہوا وہاں جاکر دیکھا تو دانائی ، دور اندیشی ، کفایت شعاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسائش کو چھپاکر زندگی بسر کرنے لگے ۔ اے اہل علم! اب وہی زمانہ ہے ۔عزت و آسائش چاہو تو اس طرح گذارہ کرو۔

کیوں آزاد! مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں۔ نہ انعام سے خوش نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا دل آزاد دے اور حالت بے نیازی ۔

رتن

ابن الوقت کی تبدیلِ وضع

(علامہ نذیر احمد)

ابن الوقت یہ کہہ کر پھر مردانے میں چلا آیا۔ نماز مغرب کے تھوڑی دیر بعد جاں نثار آ پہنچا۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلی بات اس نے یہی کی کہ "آج صاحب ہوا خوری کو بھی نہیں گئے۔ آپ کے چلے آنے کے بعد سے جو چھٹیاں لکھنے بیٹھے تو میرے خیر نے چراغ ہی جلا دئے، پھر مجھ کو بلا کر آپ کے پاس حاضر ہونے کا حکم دیا کہ ابھی چلے جاؤ۔ صاحب آپ سے اس قدر خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو ملاقاتی آتا ہے آپ کا تذکرہ اس سے ضرور کرتے ہیں اور میز پر تو صاحب لوگوں میں برابر آپ ہی کا مذکور رہتا ہے وہ تو آپ شہر میں رہتے ہیں اور آپ کا مکان بھی پیچ در پیچ گلیوں میں ہے اور گلیاں بھی صاف ستھری نہیں۔ اگر کہیں آپ ان ہی لوگوں کے میل میں شہر کے باہر کسی بنگلے میں رہتے ہوتے تو دیکھتے کہ سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک انگریز آپ کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ صاحب ہیں تو یہ لوگ کہنے کو کافر مگر مروت اور خدا ترسی اور اخلاق غرض نیکی کی کل باتیں جیسی میں نے ان لوگوں میں دیکھیں۔ ہم لوگوں میں تو کہیں پاسنگ بھی نہیں۔ یہ نہ ملنے تک کے ہوّا ہیں اور ملے پیچھے ایسے ملتے ہیں

کہ کیا کوئی اتنا ملے گا۔ میم صاحب کی چٹھی ولایت سے آتی ہے تو سائیسوں تک کو سلام لکھتی ہیں اور نام بنام ایک ایک کے بیوی بچوں کی خیر و عافیت پوچھتی رہتی ہیں۔ سامنے والی نیلی کوٹھی میں فوج کے ایک صاحب رہتے ہیں ان کی میم صاحب اور بابا لوگ بھی ہیں کل نہیں پرسوں کوئی رات کے ڈو بجے ایک آیا کے سینے میں درد اُٹھا۔ اسی وقت صاحب آپ جا کر ڈاکٹر کو لائے اور دونوں میاں بی بی صبح کے پانچ بجے تک اس آیا کے پاس سے ہلے نہیں بھلا آج کوئی ہندوستانی سردار ہے جو ادنیٰ نوکروں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرے۔ معاملے کے ایسے سچے کہ کسی نوکر کو کیسے ہی ناراض ہو کر موقوف کریں کیا مجال کہ کسی کی تنخواہ کی کوڑی لگا رکھیں ہم لوگوں کی طرح نہیں کہ پہلے چوری کی تہمت کا منصوبہ سوچ لیں، تب نوکر کے نکالنے کا نام لیں اور تنخواہ تو تنخواہ اگر نوکر تن بدن کے کپڑے سلامت لے کر عزت و آبرو سے رخصت ہو جائے تو بڑا خوش نصیب۔ ہم لوگوں میں سے جو کوئی تھوڑے دنوں کے لئے بھی انگریز کو چھو گیا ہے پھر کسی ہندوستانی کی نوکری اس سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر مذہب کا فرق نہ ہوتا تو چاہے آپ اس کو نمک کی تاثیر سمجھیں انگریز میرے نزدیک پوجنے کے قابل تھے۔ بال بچوں کی طرح نوکروں کی پرداخت کرتے ہیں۔

ابن الوقت۔ " سب انگریز ایک مزاج کے نہ ہوں گے۔ اتفاق سے تم کو جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پڑا اچھے ہی اچھے ملے۔"

جاں نثار۔ " ہاتھ کی پانچ انگلیاں تو کیوں کر برابر ہو سکتی ہیں۔ اچھے بُرے سبھی جگہ ہیں مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ انگریزوں میں اکثر اچھے ہم میں اکثر برے ہیں۔"

ابن الوقت۔ "میں سمجھتا ہوں شاید فوجی انگریز زیادہ اکھڑ اور بدمزاج ہوتے ہوں گے"۔

جاں نثار۔ "ہرگز نہیں۔ ایسے بھلے مانس، دل کے سخی، اور بے تکلف کہ ملکی انگریز کی دوستی نہ فوجی کی صاحب سلامت۔ ہاں دوغلے جن میں ہندوستانیوں کا تخم ملا ہے ان کی جس قدر برائی کی جائے تھوڑی ہے۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ ان کا بس چلے تو ہندوستانیوں کو کچا کھا جائیں۔ ان دنوں کا تو کچھ ٹھکانا نہیں۔ غدر کے دنوں میں ہندوستانیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی ایذائیں ان لوگوں کو پہنچی ہیں۔ اس سے دلوں میں غصہ بھرا ہوا ہے۔ اور سرِشتے کا ہوتا تو ملک میں گدھوں کا ہل پھروا کر بھی بس نہ کرتا۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ یہ ان ہی لوگوں کے حوصلے ہیں کہ رعیت نے اتنا ظلم کیا اور ان کو رعیت کا اجاڑنا منظور نہیں۔ صاحب تو ایسا فرماتے تھے کہ یہ پکڑ دھکڑ بھی تھوڑے دن کی ہے۔ ہمارے یہاں تو صاحب لوگوں کا بڑا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ لوگ آپس میں اکثر غدر ہی کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ میں انگریزی خوب تو نہیں سمجھتا مگر اتنا معلوم ہے کہ اب رحم کی نظر زیادہ ہے۔ یہ غدر بھی ایک کسوٹی تھی۔ جس طرح کھوٹے کھرے ہندوستانی الگ پہچانے گئے۔ اسی طرح بُرے بھلے انگریز۔ جو لوگ ان میں شریف خاندانوں کے ہیں وہ درگزر ہی کی رائے دیتے ہیں۔ ایک روز ہمارے صاحب تذکرہ کرتے تھے کہ ولایت میں پہلے یہ قاعدہ تھا کہ سرکار شریف خاندانوں کے لڑکوں کو اپنے خرچ سے پڑھا لکھا کر ہندوستان کی نوکریوں کے واسطے تیار کرتی تھی۔ ان دنوں جو انگریز آتے تھے سب

لہ طرح۔

خاندانی ہوتے تھے۔ اب چند سال سے سرکار نے اس دستور کو موقوف کر کے امتحان کا طریقہ جاری کیا ہے۔ لوگ اپنے طور پر ہندوستان کی نوکری کے لئے لیاقت بہم پہنچا کر امتحان دیتے ہیں۔ جو جو امتحان پاس کرتا ہے اس کو نوکری مل جاتی ہے شریف اور رذیل کا امتیاز نہیں ہوتا۔ اکثر عوام کے بلکہ دھوبی، حجّام، موچی، بھٹیارے وغیرہ پیشہ وروں کے لڑکے جن کی ولایت میں کچھ بھی عزت نہیں محنت کر کے امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے تعلیم یافتہ ہوئے ہیں شک نہیں مگر تاہم ع اصل بدازخطا خطا نہ کند[1]۔ ان کی ذات سے رعایا کو کم تر فیض پہنچتا ہے۔ مگر میں تو یہی کہوں گا کہ ان کے برے بھی اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ آپ ان سے ملیں تو میرے کہے کی آپ کو تصدیق ہو۔"

ابن الوقت۔ "نوبل صاحب بھی مجھ کو یہی صلاح دیتے ہیں۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ مجھ کو برابری کے دعوے سے انگریزوں میں ملائیں۔"

جاں نثار۔ "ملنے کا مزہ بھی برابری ہی میں ہے۔ یہ کیا کہ امیدوار آئے گئے۔ اردلیوں کے دھکے کھائے، سارے دن کی محنت میں دور سے سلام ہوا، نہ بات نہ چیت۔ اور خدانخواستہ آپ کو اس طرح ملنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ چلئے ادھر ہی ایک کوٹھی کرائے کی لے کر رہئے تو بڑا مزہ ہو۔"

ابن الوقت۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریز مجھ کو اپنی سوسائٹی میں لینا پسند کریں گے۔"

جاں نثار۔ "آپ کو اور آپ کے غلاموں کو۔ آپ کی صورت شکل اور شان میں ماشاء اللہ کسی طرح کی کمی نہیں۔ خدا نے آپ کو امیر کیا ہے۔

---

[1] کمینہ ضرور کمینہ پن کرتا ہے۔

کچھ یہ بات نہیں کہ آپ اونچی حیثیت سے رہ نہیں سکتے۔ انگریزی میں کسی قدر کمی ہے سو آپ باتیں سمجھ تو سب لیتے ہیں بولنے میں جھجک ہے۔ دو چار مہینے میں ملنے جلنے سے خود بخود نکل جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر تو صاحب کا زبردست پایہ ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آج اسٹیشن[1] میں ان کی وہ بات بن رہی ہے کہ واہ وا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دن جاتا ہے آپ کو کچھ کام بھی ضرور ہونے والا ہے۔"

ابن الوقت۔ "مگر ہندوستانی اس کی نسبت کیا خیال کریں گے۔"

جاں نثار۔ "ہندوستانی تو یہی سمجھیں گے کہ آپ کرسٹان ہو گئے اور میں تو جانتا ہوں اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی بیسیوں آدمیوں نے تو آج ہی مجھ سے پوچھا ہے۔"

ابن الوقت۔ "تم انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے کو کیسا خیال کرتے ہو۔"

جاں نثار۔ "صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ روم اور مصر اور ایران اور عرب کہیں کے مسلمان پرہیز نہیں کرتے، بے تکلف انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے لوگ تو بڑی چھوت مانتے ہیں۔"

ابن الوقت۔ "خیر جیسی پیش آئے گی دیکھی جائے گی۔ میں نے نوبل صاحب سے وعدہ کر لیا ہے، مگر انگریزوں کی شان کے مطابق سامان کا بہم پہنچانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

جاں نثار۔ "جناب ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس کا تو آپ خیال بھی نہ کیجئے۔ کلکتے میں جنرل سپلائر ایک کمپنی ہے۔ اس کا ایجنٹ یہاں آیا ہوا ہے۔ ایک بنگلہ تجویز کر کے اس کو دکھایا جائے گا کہ اس طور پر اس کو سجا دو

---

[1] یہاں بہ معنی فوجی چھاؤنی آیا ہے۔

ہمارے صاحب نے بھی تو یہی کیا ہے۔ اس کوٹھی کی تو چھت تک بھی اکھاڑ کرلے گئے تھے۔ صاحب جھجر جاتے ہوئے اس ایجنٹ سے کہتے گئے۔ اس نے ایک ہی مہینے میں مکان بنوا دیا۔ اور جتنا ساز وسامان آپ دیکھتے ہیں سب مہیّا کر دیا۔ ہماری کوٹھی کے مقابل سڑک پار ۴۳ نمبر کا بنگلہ خالی ہے۔ صاحب سے بھی قریب ہے۔ موقع بھی اچھا ہے۔ شاید چالیس پینتالیس ایسا ہی کچھ کرایہ ہے۔ اگر حکم ہو اس کو روک دیا جائے، جس مہاجن کا بنگلہ ہے اس نے حال ہی میں اس کو درست کرایا ہے، غدر میں یہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جزل سپلائر کا ایجنٹ دو ہفتے کے قریب میں جیسا کہ فرمایئے گا سجا دے گا۔ ان لوگوں میں ٹھیرانے چکانے کا دستور نہیں بِل بنا کر بھیج دے گا۔ آپ اس رقم کو چکا دینا۔ نہ ہڑ ہڑ نہ کھڑ کھڑ۔ بلکہ فرمایئے تو میں صاحب سے عرض کر دوں۔ وہ تو خوشی خوشی اس کا انتظام کر دیں گے۔ مگر کہیں گے وہ بھی ایجنٹ سے۔"

ابن الوقت۔ "نہیں۔ صاحب کو کیوں تکلیف دو، تمھیں جس طرح مناسب سمجھو کر دھرلو۔ اور ہاں بھائی کپڑوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

جاں نثار۔ "ہر چیز میل سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پیروں میں انگریزی ہاف بوٹ۔ ٹانگوں میں ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ، آدھی پنڈلیاں کھلی ہوئی، یا کوٹ پتلون کے ساتھ سر پر عمامہ یا اسی طرح کی دوسری بے جوڑ چیزیں مجھ کو تو بری معلوم ہوتی ہیں۔ نقل کیجئے پوری پوری کیجئے ورنہ دونوں جگہ ہنسی ہوگی۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔"

ابن الوقت۔ "خیر تو ایک سال کے کپڑے کے لئے بھی ایجنٹ سے فرمائش کر دینا۔ اور چوں کہ تم انگریزی سوسائٹی کے دستور سے بخوبی واقف

ہو، اس بات کا خیال رکھنا کہ انگریزوں کی نظر میں سبکی نہ ہو۔"
جاں نثار۔ "کیا مجال۔ خدا نے چاہا تو آپ کی کوٹھی سرتاپا ایسی آراستہ ہو کہ لیڈیاں دیکھنے کو آئیں۔ اور ساری چھاؤنی میں آپ کے کھانوں کا غل ہو۔ اصل چیز ہے روپیہ اور سلیقہ، سو روپیہ کی خدا کے فضل سے آپ کے پاس کمی نہیں اور سلیقہ خاک چاٹ کر کمتا ہوں، برسوں میم صاحب کی جھڑکیاں سہیں۔ گھڑکیاں سنیں۔ صاحب نے لاٹ گورنر کو کھانا دیا۔ شاہ زادہ بلجیم کی دعوت کی۔ خیر اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرنی مناسب نہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔ اس بات کو آپ دریافت کر لیجیے کہ چھاؤنی میں جب کوئی بڑا کھانا دیا جاتا ہے، آپ کے خانہ زاد ہی کو بلاتے ہیں۔ فرنیچر کا سجانا بڑا مشکل کام ہے۔ اچھے اچھے چوک جاتے ہیں۔ مگر میم صاحب نے میرے پیچھے بڑی جان ماری ہے، تب کہیں برسوں میں جا کر یہ بات حاصل ہوئی ہے۔ خیر اور سب باتوں کو تو میں دیکھ بھال لوں گا مگر آپ کو خود بھی انگریزی قاعدہ سیکھنا چاہیے کیوں کہ آپ ہوں گے صاحب خانہ۔ آؤ بھگت، استقبال، رخصت، مزاج پرسی، تواضع وغیرہ بہت سے کام آپ کو اپنی ذات سے کرنے پڑیں گے۔ ایک ذرا سی بے تمیزی سے سارا کیا دھرا اکارت ہو جاتا ہے۔ لیڈیوں کے ساتھ ملنے میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میم صاحب کی دی ہوئی اٹیکٹ کی میرے پاس ایک کتاب ہے۔ میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ایک دفعہ وہ کتاب نظر سے گزر جائے گی تو سارے کام سدھ ہو جائیں گے اور آخر ان لوگوں کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی تو آپ دیکھیں گے۔ شروع شروع میں ذرا اس کا خیال رکھیے گا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کیوں کر برتاؤ کرتے ہیں۔"

نوبل صاحب بے چارے کا کچھ دوش نہیں انھوں نے اپنے انگریزی خیالات کے مطابق نیک نیتی سے اپنے دوست ابن الوقت اور اس کی قوم کے حق میں مفید سمجھ کر اس کو ایک صلاح دی۔ ابن الوقت دودھ پیتا بچہ نہ تھا کہ نوبل صاحب کے جھانسے میں آگیا۔ اس کو اپنی قابلیت، قوم کی حالت اطراف و جوانب، نتائج و عواقب پر نظر کر کے کام کرنا تھا۔ بات یہ ہے خود اس کی طبیعت شروع سے اس طرف راغب تھی۔ نوبل صاحب کا کہنا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات کی وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی۔ مگر وہ ایک شخصی رائے تھی نہ کسی کے حق میں مفید نہ کسی کے لئے کار آمد۔ اتنی بات ابن الوقت کو نوبل صاحب نے سمجھائی کہ اس خیال سے کس طرح پر اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ابن الوقت کی ظاہری حالت کے بدلنے میں ابھی دیر ہے۔ مگر جان نثار کے چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی خیال میں مستغرق ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو معلوم ہوا کہ گویا نوبل صاحب کی سی کوٹھی ہے اور خانہ باغ میں کرسی بچھائے صاحب لوگوں کی شکل بنائے بیٹھا ہوا شب ماہ کے مزے لے رہا ہوں۔ پھر آپ ہی آپ چونک پڑا کہ اس حالت میں کسی نے مجھ کو دیکھا تو نہیں۔ تب وہ اس خیال کو دفع کرتا ہے کہ "اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں کا کیا ڈر"۔ رہ رہ کر اس کو خیال آتا ہے کہ اپنے عزیز، رشتہ دار، دوست، آشنا، جان پہچان اہل محلہ، اہل شہر، اہل ملک، میرے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ یہ تصور ہے کہ رفارم پر طبیعت کو مطلقاً نہیں جمنے دیتا کہ اس کا کچھ منصوبہ سوچے۔

نوبل صاحب کو زبان دے پیچھے اس ارادے سے دست کش ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔

کبھی جی ہی جی میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہے کہ جلدی ناحق کی۔ پھر کہتا ہے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوگا کہ نوبل صاحب بچ رہیں۔ غرض ابن الوقت ہر وقت سوچ میں رہتا تھا اور زیادہ دیر تک سوچتے سوچتے گھبرا اٹھتا تھا اور چاہتا کہ جو کچھ ہونا ہے برسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج ہو جائے۔ صرف ایک آدمی نوبل صاحب تھے جن کے ساتھ وہ اس بارے میں صلاح یا مشورہ یا گفتگو یا بحث جو کچھ کہو کر سکتا تھا۔ وہ بھی ان دنوں کسی سرکاری ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ پس ابن الوقت کا ایک مہینہ کیوں خاصے دس دن اوپر ایک مہینہ بہت ہی پریشانی میں گزرا۔ مگر اس کو انگریزی ایٹکیٹ سیکھنے کی خوب مہلت ملی۔ اسی اثنا میں جاں نثار نے ضروری ادب و آداب اس کو سب تعلیم کر دیے۔ گویا انگریزی سوسائٹی کی یونیورسٹی کا انٹرنس پاس کرا دیا۔ بارے مئی ۱۸۵۸ء کی تیرہویں تاریخ تھی کہ جاں نثار نے آکر خبر دی کہ لیجیے حضرت! آج دن کے چار بجے سب سامان آپ کو مہیا ملے گا دیر تو ہوئی، مگر کوٹھی کو بھی ایجنٹ نے ایسا سجایا ہے کہ پڑی جگمگا رہی ہے۔ دیکھیے گا تو پسند کیجیے گا اور آج رات کو نو بجتے بجتے صاحب بھی خدا نے چاہا تو آ پہنچیں گے۔ آپ چاہیں آج رات کو وہیں چل کر آرام کریں دن بھی اچھا ہے۔ مہورت بھی اچھا ہے۔ خدا مبارک کرے۔"

ابن الوقت۔ "بہتر ہے۔ صاحب کو آلینے دو اور خوب دھیان کر لو کسی چیز کی کسر تو نہیں رہ گئی۔"

جاں نثار۔" میں نے اچھی طرح خیال کر لیا اور دو ایک شخصوں کو بھی دکھا لیا ہے۔ بس اگر کسر ہے تو آپ ہی کی ہے۔ انشاء اللہ ہر چیز آپ تیار پائیں گے۔"

آفتاب نکلا ہی تھا کہ اگلے دن نوبل صاحب کا بلاوا آموجود ہوا۔ نوبل صاحب جیسا ان کا دستور تھا، بہت تپاک سے ملے اور کچہری کے بکس سے ایک چٹھی نکال ابن الوقت کے حوالے کی کہ لیجئے مبارک۔ ڈھائی سو کی اکسٹرا اسسٹنٹی کی منظوری آئی ہوئی چار دن سے میرے پاس رکھی ہے۔ چوں کہ میں آنے کو تھا میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے چٹھی اور زبان سے مبارک باد دوں۔ ایک بات میں نے آپ کے بے پوچھے کی کہ مقدمات تحقیقات بغاوت میں مجھ کو آپ سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کے ختم ہونے تک میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لے لیا۔"

ابن الوقت۔" آپ نے احسانات سے اس قدر مجھ کو لاد دیا کہ شکر گزاری کا نام منہ سے نکالنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بھلا خیر زمینداری تک تو مضائقہ نہ تھا۔ یہ اکسٹرا اسسٹنٹی کیوں کر میرے سنبھالے سنبھلے گی۔"

نوبل صاحب۔" ایسی سنبھلے گی کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ ضوابط کچہری سے آپ کو ایک طرح کی ناآشنائی بے شک ہے۔ سو کچھ بڑی بات نہیں۔ اور اسی غرض سے میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لیا ہے۔ ایک ہوشیار سا منشی آپ کے اجلاس پر تعینات کر دیا جائے گا اور وہ تھوڑے دنوں میں آپ کو ضوابط سے آگاہ کر دے گا۔ آپ کے لئے زمینداری کی اس خدمت کی تجویز ہو چکی تھی۔ مگر ایک دم سے اتنی بڑی نوکری دیتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تھے۔ آخر لاٹ صاحب کے یہاں

سے منظوری منگوائی گئی۔ حسن اتفاق سے آج غدر کو بھی پورا برس ہوا۔ بس کل سے ضلع کی کچہری میں میرے اجلاس کے پہلو میں اجلاس شروع کیجئے۔ میں جاں نثار سے یہ بات سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ نے ۴۲ نمبر کا بنگلہ اپنے رہنے کے لئے تجویز کیا ہے اور وہ بہ ہمہ وجوہ مرتب بھی ہو گیا ہے۔"

ابن الوقت۔" شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ میں مکان کے ساتھ لباس اور تمام ہندوستانی طرز کو بھی بدلنے والا ہوں۔"

نوبل صاحب۔" آہا۔ آپ کو پورا پورا رفارمڈ اور رفارمر جنٹلمین دیکھ کر میں بہت ہی خوش ہوں گا۔"

کھانے کا وقت تھا قریب۔ نوبل صاحب نے چاہا کہ ابن الوقت بھی شریک ہو مگر اس نے عذر کیا کہ بس آج اس وقت اور معاف کیجئے اس وقت کے بدلے اگر آپ چاہیں تو میں رات کو کھانے میں وضع جدید کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں۔ مجھ کو اس حالت سے آپ کے پاس بیٹھنا، باتیں کرنا اور آپ کے ساتھ کھانا کھانا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔"

نوبل صاحب نے اس بات کو پسند کیا اور فرمایا کہ آج ڈنر میں اپنے احباب کو بھی جمع کروں گا اور کھانے کے بعد سب سے آپ کی تقریب بھی کرا دوں گا۔ تاکہ ایک جلسہ میں سب صاحب لوگوں سے معرفت ہو جائے۔

نوبل صاحب کے پاس سے اٹھا تو جاں نثار ابن الوقت کو سیدھا اس کے ساتھ حجامت کروا اصطباغ دے یعنی نہلا دھلا موسم اور وقت اور موقع کے لحاظ سے فیشن کے مطابق انگریزی سوٹ پہنا نکتہ وچی پوزی یعنی برلیسز ٹائی کالر سب کس کسا کر اس کو اچھا خاصا عین مین یوریپن بنا دیا۔ ابن الوقت

نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ اشبہ پایا۔ بے اختیار
تن کر لگا کپڑے بدلنے کے کمرے میں بیترے بدلنے۔ کھانے کے بعد اس
کے کئی گھنٹے کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزرے۔ گرمی کے دن چاروں طرف
خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھرمینیڈ سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے
ہیں۔ کوچ پر دراز ہونا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے
بدل باہر نکل گیا۔ کوئی دو گھڑی رات جاتے جاتے لوٹ کر آیا۔ تو نوبل صاحب
کے یہاں جانے کا وقت قریب تھا۔ ڈنر کے لئے تیاری شروع ہوئی۔ کچہری نہیں،
دربار نہیں، کوئی پارٹی نہیں، اس پر بھی دن کے گیارہ سے لے کر اب یہ
تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی متقاضی ہے۔ سڑک
بیچ نوبل صاحب کی کوٹھی تھی جب معلوم ہوا کہ اور مہمان آنے شروع ہوئے،
یہ بھی اپنے بنگلے سے اٹھ جا موجود ہوا۔ کھانے سے پہلے اور کھانے میں
صاحب لوگ اس کو اجنبی سمجھ کر بار بار دیکھتے تھے لیکن چوں کہ کسی نے اس
کو انٹروڈیوس نہیں کیا تھا کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ تم کون ہو اور
نہ یہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ نوبل صاحب مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے
تھے ان سے لمحہ دو لمحہ کا چھٹکارا پاتے تو ابن الوقت سے ایک دو بات
کر جاتے۔ ڈنر کہ اچھا خاصا پہر ڈیڑھ پہر کا جھمیلا تھا۔ جہان کے قصے اور
دنیا کی بکواس۔ خیر خدا خدا کر کے ڈنر سے چھٹی پائی۔ ابھی سب اپنی اپنی کرسیوں
پر بیٹھے ہیں کہ نوبل صاحب نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی۔
"صاحبو! یوں تو آپ صاحبوں سے اکیلے دکیلے یا مجمع میں ملنا خوشی کا
موجب ہوتا ہی ہے۔ مگر آج کی رات کی ملاقات ایک خاص وجہ سے بہت

بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کو دعوت کے رقعوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ آج کی دعوت سے ایک نئے دوست کو آپ کی سوسائٹی میں انٹروڈیوس کرنا منظور تھا۔ (چیرز) اگرچہ میرے اکثر حالات غدر بھی آپ سب صاحبوں نے بار بار میری زبان سے سنے ہیں مگر میرے حق میں وہ ایسے دلچسپ ہیں کہ ہر بار کے بیان کرنے میں مجھ کو ایک نیا مزہ ملتا ہے۔ اور اس سے میں قیاس اور امید بھی کرتا ہوں کہ اس محل پر ان کا بالتفصیل اعادہ کرنا نہیں بلکہ مختصر طور پر ان کی طرف اشارہ کر دینا کسی صاحب کی طبیعت پر ناگوار نہیں گزرے گا (ہرگز نہیں ہرگز نہیں)۔ یہ ہرگز میرے خیال میں نہیں آتا کہ غدر میں مجھی پر سب سے زیادہ مصیبت پڑی۔ مگر اتنا تو میں ضرور سمجھتا ہوں کہ میرے حصہ کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ مجھ کو غدر نے اچانک آدبایا جب کہ میں بر عزم ولایت بمبئی جاتے ہوئے علالت مزاج کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے مسافرانہ دہلی کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا جان پہچان یا دوست یا دردمند جو کچھ سمجھو میرا ایک ذاتی ملازم تھا جو اب بھی میرے پاس ہے اور وہ بمبئی تک میرے ساتھ جانے والا تھا۔ مجھ کو اس شدت کا درد سر تھا کہ تکئے پر سے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دفعتہً دین دین اور علی علی کا غل سن پڑا اور ایک منٹ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ شہر کی بازاری خلقت بنگلے میں ٹوٹ پڑی۔ میرا آدمی مجھ کو پیچھے معلوم ہوا، اس وقت میری دوا کے لئے شفاخانہ گیا ہوا تھا۔ ان ہی لیٹروں میں سے پانچ چار لٹھنگے[1] مجھ کو کشاں کشاں کشمیری دروازے باغیوں کے گارد میں لے گئے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اور چند انگریز مرد اور عورتیں اور بچے

---

[1] موٹے مشٹنڈے۔

قیدیوں کی طرح زمین پر بیٹھے ہیں ۔ مجھ کو بھی ان ہی میں بٹھا دیا ۔ مگر ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دردِ سر جو ایک لمحے کے لئے مفارقت نہیں کرتا اور جس نے مجھ کو ولایت جانے پر مجبور کیا تھا، اس وقت بالکل زائل ہو گیا ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آدمی کو دیکھا تھا کہ تماشائیوں میں ملا ہوا مجھ کو دیکھ رہا ہے ۔ اس کا چہرہ اداس تھا اور اس کی صورت پریشان مگر وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تو وہ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتا تھا لیکن جب میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کسی نہ کسی طرف اس کو کھڑا ہوا پایا ۔ اس سے میں سمجھا کہ وہ میری مصیبت پر متاسف ہے ۔ حوالات کی مصیبت کا بیان کرنا دیر طلب بات ہے ۔ اور میں اس کے تذکرے سے سکوت کرتا ہوں ۔ کیوں کہ مجھ کو کچھ اور بھی کہنا ہے ۔ تیسرے دن ہم سب کو گھیر کر میگزین کے میدان میں لے گئے اور جب تک قلعے کے حوالاتی آئے ہم کو کھڑا رکھا ۔ پھر سب کو بٹھا کر باڑھ ماردی ۔ اس وقت تک بھی میں نے اپنے آدمی کو کالج کے دروازے کے پاس دیکھا ۔ شاید میرا دماغ مدتوں کے دردِ سر سے ضعیف ہو رہا تھا کہ باڑھ کے صدمے سے یا زخموں کی وجہ سے مجھ کو غش آ گیا ۔ اس وقت تک جو کچھ میں نے بیان کیا وہ میری ذاتی معلومات ہے ۔ اس کے بعد جو میں نے آدھی رات سے بعد آنکھ کھولی اور مجھ کو ہوش آیا تو میں نے اپنے تئیں ۔ (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے) ان کے مکان میں پایا ۔ جن سے ملنے کو میں نے آپ صاحبوں کو بلایا ہے (چیرز) ۔ میں یہ بات کچھ اس نظر سے نہیں کہتا کہ اپنے وفادار نوکر کی خیر خواہی کو میں اعلیٰ درجے پر نہیں خیال کرتا ۔ مگر اس پر

میرے احسانات اور نمک کے حقوق ثابت تھے نگران صاحب کو بلکہ ان کے معزز خاندان میں سے کسی کو کبھی کسی انگریز سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا۔ انھوں نے چند سال تک دہلی کالج میں مشرقی علوم کی تعلیم پائی اور کالج چھوڑنے کے بعد اپنی موروثی خدمت پر شاہی ملازموں میں جا ملے۔ پس عام ہمدردی اور نیک دلی کے سوائے اور کوئی خیال ان کو میری پناہ دہی کا محرک نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ میری شکل و صورت کو دیکھتے ہیں کہ اگر میں بھیس بدل کر ہندوستانیوں میں ملنا چاہتا تو رنگ اور بال اور آنکھیں ہر چیز میرا پردہ فاش کرنے کو موجود تھی۔ اس کے علاوہ ان کا گھر خانقاہ سے جس کو مجاہدین کا اکھاڑا کہنا چاہیے بہت ہی قریب ہے۔ پس میرا پناہ دینا بڑی خطرناک بات تھی۔ خصوصاً ملازم شاہی کے حق میں۔ پھر مدارات جو انھوں نے کی شروع سے آخر تک یکساں تھی۔ اور یہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ میری پناہ دہی میں کسی غرض دنیاوی کو دخل نہ تھا۔ میں ان باتوں کا چنداں اپنی احسان مندی ظاہر کرنے کے ارادے سے ذکر نہیں کرتا بلکہ صاحبوں کے ذہن سے اس غلط اور بے اصل خیال کو نکالنا چاہتا ہوں کہ حکومت انگریزی کا سب سے بڑا دشمن مذہب اسلام ہے۔ بانیٔ اسلام نے بالتخصیص عیسائیوں کی نسبت قرآن میں اپنی رضامندی اور خوشنودی صاف طور پر ظاہر کی ہے۔ انھوں نے اپنے معتقدین کے لئے ہمارے ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اور میں نے قسطنطنیہ اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ بے تامل کھاتے پیتے ہیں اور ان کا لباس بالکل ہم لوگوں کا سا ہے صرف قرآن کا شعار قومی مابہ الامتیاز

ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا دو بڑے ذریعے اتحاد پیدا کرنے کے ہیں اور ان دونوں باتوں کی اجازت سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کو منظور تھا کہ ان کے گروہ کے آدمی ہم لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سوائے اور ملکوں کے مسلمان اس حکم کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی صحبت نے بڑے بڑے نقصان پہنچائے ہیں، اور منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمان ان ہی کی طرح شکی اور وہمی ہو گئے ہیں پس جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے ہے ہرگز مذہبی نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے جو انھوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں ہرگز اس نفرت میں شریک نہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ دہلی کے مسلمانوں میں جو مستند عالم تھے باغیوں نے ہر چند ان پر سختی کی مگر انھوں نے جہاد کا فتویٰ دینے سے انکار کیا اور ان ہی انکار کرنے والوں میں یہ میرے دوست بھی تھے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باغیوں میں بہت سے مسلمان بھی ہیں۔ مگر کون مسلمان؟ اکثر عوام الناس، پاجی، کمینے، رذیل جن کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں۔ یا اگر کسی رودار مسلمان نے بغاوت کی ہے تو مذہب کو اس نے صرف آڑ بنایا ہے۔ دراصل میں غصہ یا لالچ یا کوئی اور سبب محرک ہوا ہے جس طرح ہماری قوم ہمیشہ سے بہادری میں نامور رہی ہے، اسی طرح ہمارا سچا مذہب بردباری اور درگزر میں اور خدا کی مقدس مرضی نے ہم کو ان دونوں صفتوں میں آزمانا چاہا۔ ہم بہادری کی آزمائش میں خدا کے فضل سے پورے اترے اب ہم کو دوسری آزمائش میں پورے اترنے کی کوشش

کرنی چاہیے۔ جب تک ہم مغلوب تھے ہم نے بہادری سے کام لیا، اب ہم کو خدا نے غلبہ دیا ہے تو چاہیے کہ بردباری اور درگزر سے کام لیں۔ قدرت پاکر معاف کر دینے سے ایشیائی قومیں ہم کو ضعیف سمجھنے کے عوض بہت زیادہ طاقت ور خیال کریں گی۔ سلطنت کی عمارت میں بہادری نے اگر گارے کا کام دیا ہے تو بردباری چونے گچ کا کام دے گی۔ (ابن الوقت کی طرف اشارہ کرکے) انھوں نے مجھ پر اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہے کہ آئندہ ہندوستانیوں یعنی کم سے کم اپنے ہم قوم مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا اور مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ ضرور کریں گے تو گورنمنٹ کو چاہیے کہ میری پناہ دہی سے بڑھ کر ان کی کوشش کی قدر کرے۔ میری پناہ دہی کے صلے میں گورنمنٹ نے ان کو ڈھائی سو روپے ماہوار کے منافع کی زمین داری عطا فرمائی ہے اور اکسٹرا اسسٹنٹی کی خدمت جو ہندوستانی کے لئے اعلیٰ درجہ کی نوکری ہے۔ تمام زمانہ غدر میں ان کے پاس رہنے سے مجھ کو ان کے تفصیلی حالات معلوم ہیں۔ علوم مشرقی کے یہ بڑے عمدہ اسکالر ہیں۔ انھوں نے دہلی کالج میں جغرافیہ اور تاریخ اور پولٹیکل اکانمی اور ریاضی وغیرہ علوم بخوبی پڑھے ہیں۔ ان کی عام معلومات اونچے درجے کی اور قابلِ قدر ہے۔ ان کو اخبار بینی کا بڑا شوق ہے۔ ان کے خیالات وسیع اور شگفتہ ہیں۔ غرض آپ لوگ اگر ان کے ساتھ ارتباط پیدا کرنا چاہیں گے تو مجھ کو امید ہے کہ آپ ان کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ ہوں گے۔ اب شاید آپ صاحبوں کو زیادہ دیر تک باتوں میں لگائے رکھنا موجب تصدیع ہوگا۔ اس واسطے شکر قدوم پر تقریر کو ختم کرتا ہوں۔"

اُردو غزل پر ایک نظر

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الاماشاءاللہ بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لئے ہوئی تھی، مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بیکار نہیں رہ سکتی، اس لئے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جن سے اس کا دل

روزمرّہ کسی واقعہ کو سن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ متکیّف ہوتا ہے، ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو۲ مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے، اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے، وہ غزل کے سلسلے میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہیں، وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد و سماع کی مجلسوں میں لہو و لعب کی صحبتوں میں، تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے، اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں، جو لوگ کتاب کے مطالعے سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس میں ہر مضمون دو۲ مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے اس لئے

ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ غزل میں جو عام دل فریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان، پٹے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی، بوالہوسی اور کام جوئی کی باتوں میں جو مزہ ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا، اوباش و الواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے، جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا، جو لوگ، سرمہ، کاجل، کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا، ہم نے حیات سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے، ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور بور تھے، ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی

چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے، وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا اور مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں، وہ رندی، بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق اور زاہدوں کی زاہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرور مال و جاہ سے کوئی شرک خود پرستی سے اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی، جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانے کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم، طمّاع، حریص اور بخیل، عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریا کار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیّار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے، وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امّارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقے میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں

مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقے پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

۱۔ غزل کے لئے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا، پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں

معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں ہے، بندے کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، خاوند کو بیوی کے ساتھ، بیوی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے۔ پس جب کہ عشق و محبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جب کہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتا بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لئے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں، اور جہاں تک ہو سکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ، چہرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزۂ خط، مسیں بھیگنا، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسا بچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ۔

اگرچہ جیسا کہ حیات سعدی کے خاتمے میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے، مرد کا مطلوب مرد کو، قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج

ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور قومی حمیت کے خیال پر مبنی ہے، نہ کہ حقائق اور واقعات پر، لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نالائق دستور ہے جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے، لہذا اس کو جہاں تک ممکن ہو ترک کرنا چاہیے، اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقے پر غزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانے کا اقتضا الگ ہوتا ہے، جو فحش اور بے حیائی کی باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے پرانوں کے کلام میں موجود ہیں، اگر ہم آج ویسی باتوں میں ان کی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں، پس جہاں ہم نے ان کی بہت سی خرافات مواخذۂ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں ان کی ایک آدھ خرافت محض عقل اور اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں، جو پردے کے قاعدے کی پابند ہو، کیوں کہ اگر معشوقہ کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن وجمال کی تعریف کرنی اور اس کے کرشمۂ نازو انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ وناموس کو اپنوں اور پرایوں سے انٹروڈیوس کرانا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی اور بدنیتی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے، اسی بنا پر ایران میں جتنے ممتاز اور برگزیدہ اور اعلیٰ درجے کے غزل گو گزرے ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں، اور اتنی بات اب تک ہندوستان میں موجود ہے کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات بھی ذکر کرتے ہیں لیکن کبھی مطلوب کے لئے

افعال یا صفات مؤنث نہیں لاتے، بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں، مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزن دیوار سے جھانکتی تھی یا وہ پری ہمارا دل لے گئی یا وہ آرسی میں منہ دیکھتی تھی، یا وہ بالے پہن رہی تھی، یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے، بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں حالاں کہ مقام تانیث کا مقتضی ہوتا ہے، مثلاً ذوق کہتے ہیں ؎

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزن دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

یا امانت لکھنوی کہتے ہیں ؎

شانوں میں وہ پری زلف کو وا کیا کرتا
مو شگافوں کو گرفتار بلا کیا کرتا

غرض کہ کسی اردو غزل گو نے معشوق کے لئے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت مؤنث استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسا کی غزل میں ذکر نہ کی جائے، تو اس صورت میں افعال وصفات کا مذکر لانا بالکل قاعدے کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں ذکور و اناث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ فرد کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ کہ مؤنث۔ مذہب میں، فلسفہ میں، طب میں، اخلاق میں اور تمام علوم میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے، لیکن معشوق کو کبھی چہرہ یا قبا یا سبزۂ خط کے ساتھ

اور کبھی چوٹی، موباف، آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اس کے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ زنانہ ہے یا ہجڑا۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو محض روحانی یا عشق الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے، کیا فارسی اور کیا اردو دونوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں، پس غزل میں ہمیشہ کے لئے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے۔

۲۔ جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے نیچر میں داخل ہیں اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہا و زہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی اپنی مے خواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی و رومی و حافظ و خسرو وغیرہم چوں کہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مقبول و مشہور ہوئی ہے، اس لئے متاخرین نے بھی ان کی

تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں، ایک اہل باطن کے دوسرے اہل رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں، قیدیں بھگتی ہیں، جلاوطن کیے گئے ہیں، کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے، بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے، انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں، انھوں نے کہا شراب خواری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے، انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گم راہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے، انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور ان کے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجازاً اور استعارے کے طور پر

استعمال ہوئے ہیں یہ لوگ (یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظریے کہ لوگوں کا حسن ظن جو رہ زن طریقت ہے، اس سے محفوظ رہیں، یا اس لئے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب نکلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوش گوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں) روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے، سب سے آخر درجے کا ثبوت مولانا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے :۔

دی بر سر کوئے زلہ غارت کردم | مرپا کاں را جذب زیارت کردم
شکرانۂ آں کہ روزہ خوردم رمضاں | در عید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ رمضان میں روزہ کھانے کے یہ معنی ہیں کہ جب مجاہدے سے مشاہدے تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آگئی اور جدائی کا الم جاتا رہا، اب حضوری بے کیف جو کہ حقیقت صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی، یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے سوتے غرض کہ ہر حالت میں دولت حضوری موجود ہے، خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت | آفریں در نظر پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلم صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں کہ ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے، کیوں کہ قلم صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ

اس نے لکھ دیا ہے وہ امٹ ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اس لئے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے اس لئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دل براں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گزرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا، اس کو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چوں کہ شاعری کا جزو اعظم (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہئے، اس لئے اصول شاعری کے موافق شراب وکباب کے مضمون باندھا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہئے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرائے میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں، ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے، جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو لتاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انھیں لوگوں کو زیبا ہے، جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہ کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں، یعنی نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا، کیوں کہ رذائل کی برائی اور فضائل

کی خوبی بغیر اس کے دل نشیں نہیں کی جا سکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرائے میں ظاہر کیا جائے ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کی جائے اور نامردی یا بہادری کی تصویر یوں ہی دکھائی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے، لیکن اس صورت میں ضرور ہے کہ واعظ اور زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابل الزام ہو کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اس لئے کہ وہ قابل الزام ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے، یہاں بطور مثال کے ہم شیخ ابراہیم ذوق کے دو شعر لکھتے ہیں ؎

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں، لہٰذا اس طرز بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر　　وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا، کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہہ کر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافت طبع کی جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدی اور سوزنی کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

۳۔ مذکورۂ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت یا صبر۔ یا قناعت۔ یا توکل۔ یا رغبت۔ یا نفرت۔ یا رحم۔ یا انصاف۔ یا غصہ یا تعجب۔ یا امید۔ یا نا امیدی۔ یا شوق۔ یا انتظار۔ یا حب وطن۔ یا قومی ہمدردی۔ یا رجوع الی اللہ۔ یا حمایت دین و مذہب۔ یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال۔ یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لئے عام کر دیا ہے اور اب اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں، نہیں بلکہ ہم کو چاہئے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو، لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو۔ یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو، دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہئے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے

کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں، وہی منکشف ہوں گے، بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا۔ کیوں کہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً صائبؔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

قناعت کن بہ نانِ خشک تا بے آرزو گردی — کہ خواہش ہائے الوان ست نعمت ہائے الوان را

دوسری جگہ یہی صائبؔ کہتے ہیں ؎

صرفِ بے کاری مگرداں روزگارِ خویش را — پردۂ روئے توکّل ساز کارِ خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا، بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرائے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی، لیکن ہمارے معاصرین کے لئے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک نبڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے آج کل

دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں، تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے کہ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظارے آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا! کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ پیٹرل غزل کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا، عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کانگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا، اب جوگئے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار

میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سنّاٹا، سفر کی روئداد، وطن کی دل بستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ شعر کی لوگوں کو اتنی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانوں کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں، تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تلوّن اور تنوّع نہ ہو، ان سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح و شام، رات اور دن بھیرویں الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے، اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

تکرر گرچہ سحر آمیز باشد طبیعت را ملال انگیز باشد

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے، اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اُسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں، جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا۔ بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہہ میں ڈال سکتا ہے، اگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے، کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھ کر مشاعرے میں جاتے ہیں تو اپنے

دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اور اچھوتے مضمون باندھ کرے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھیے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے۔ فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں، کوئی مدوّر ہے، کوئی مستطیل، کوئی مربع، کوئی مسدّس اور کوئی مثمّن اب ہر ایک سانچے میں موم پگھلا کر ڈالو۔

ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھل کر نکلے گا، بعینہٖ ایسا ہی حال غزل کا ہے، مضمون وہی معمولی ہیں، مگر بحر اور ردیف وقافیہ کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

شعر کی ماہیت و حقیقت

(علامہ شبلی نعمانی)

شاعری کی حقیقت

شاعری چوں کہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لیے اس کی جامع اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہوجائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال و ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس۔ ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہوجاتا ہے غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے یہی

قوت جس کو احساس ، انفعال ، یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے، یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مثلاً شیر گونجتا ہے، مور چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے ۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لاوے وہ شعر ہے ۔

ایک یوروپین مصنف لکھتا ہے کہ " ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے" اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں ، نسیم سحر، گل گونہ شفق ، تبسم گل ، خرام صبا نالۂ بلبل، ویرانی دشت ، شادابی چمن ، غرض تمام عالم شعر ہے ۔ یہ آج کل کا خیال ہے ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج

سے چھ سو برس پہلے کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی، مصوری صنعت گری وغیرہ۔ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیّال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کسی[1] چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کرکے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہو گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا

---

[1] یہ تمام تقریر مل صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

یقین سے ہے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دل کش منظر دکھاتی ہے لیکن یہ خاصیت موسیقی، تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں تاہم خطبہ (لیکچر) تاریخ افسانہ اور ڈراما شاعری کی حد میں داخل رہیں گی۔ ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ زیادہ دقّت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے دونوں جب باہم مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیا کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایک شخص جنگل میں جا رہا ہے کسی گوشہ سے ایک مہیب شیر ڈکارتا ہوا نکلا۔ اس کی پُر رعب گونج، بھیانک چہرہ، خشم گیں آنکھوں نے اس شخص کے دل کو لرزا دیا۔ یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل وصورت جن موثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔

علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانہ میں جاتا ہے وہاں ایک

شیر کٹہرے میں بند ہے۔ یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا ہے اور علمی طریقہ سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے یہ سائنس یا تاریخ یا واقعہ نگاری ہے۔

شاعری کے اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں شاعر ان اشیا کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوت تخئیل سے رنگ بھرتا ہے تاکہ موثر ہو جائے۔

اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن خطابت اور شاعری کی حد فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی۔ خطابت میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے۔ بخلاف اس کے شاعروں کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں؛ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے، بے شبہہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کریں گے۔ لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے

مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سُن لے تو ضرور تڑپ جائے گا۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو لوگ بہ تکلّف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنے کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کردے تو سارا پارٹ غارت ہو جائے گا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نبّاض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے، الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں، بندش صاف ہوتی ہے، طرز ادا میں جدت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو

شعر شعر نہ ہوتا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے اسی لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ لیکن محققین کی یہ رائے نہیں ہے۔ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ شعر خیال کئے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس لئے تخئیل بھی محاکات ہے لیکن یہ زبردستی ہے۔ آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخئیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا، باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ

مادّی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرے سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی اور بے تابی ظاہر ہو۔ جہاں گیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلوؤں کے سہلاتے وقت چہرے پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گوناگوں واقعات حالات اور واردات ہیں جو تصویر کے دست رس سے باہر ہیں مثلاً قاآنی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے۔

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں می خزد　　غبغب ایں می مکد عارض آں می مزد
سنبل ایں می کشد گردن آں می گزد　　گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد
گاہ بہ شاخ درخت گہ بہ لب جوئے بار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔ کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس سماں کو مصور تصویر میں کیوں کر دکھا سکتا ہے؟

یہ تو مادی اشیا تھیں۔ خیالات جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے۔ تصویر اس سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامۂ دولت کیقباد　　ورق بر ورق ہر سوئے بردباد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال وخط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں۔ شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ وریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کردے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کرکے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہوسکتا جو اس شعر سے ہوسکتا ہے۔

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا ‏ ‏ ‏ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہوگیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی

پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیوں کہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب وتاب اور حسن وجمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخئیل

تخئیل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے ”وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیا کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر کے سامنے کردے“ لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔ چوں کہ اکثر سائنس داں شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے نامانوس ہوتے ہیں اس لئے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخئیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بے شبہہ

عام سائنس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں قوت تخیل نہیں رکھتے۔ لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں ان کی قوت تخیل سے کون انکار کر سکتا ہے۔ نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر زبردست قوت تخیل تھی جس قدر ہومر اور فردوسی ہیں۔ البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں کی قوت تخیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار میں ہما، سیمرغ گاوزمیں، تخت سلیماں کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کی نقش و نگار ہیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن شاعر اس قسم کے فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک پھول کو دیکھ کر سائنس داں تحقیقات کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے۔ اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس کی غذا زمین کے کن اجزائے ہے۔ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے، لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں۔ پھول دیکھ کر اس کو بے اختیار یہ

خیال پیدا ہوتا ہے ۔ ع

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے ؟ آباد ہے یا ویران ؟ روشن ہے یا تاریک ؟ سمندر کے مدوجزر سے اس کو کیا تعلّق ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روئے روشن ہے ۔ شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیا جان دار چیزیں بن جاتی ہیں ۔ اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں زمین ، آسمان ، ستارے بلکہ ذرّہ ذرّہ اس سے باتیں کرتا ہے ۔

اودھ کی آخری صحبت

(عبدالحلیم شررؔ)

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں اور یہاں آکے انھوں نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اردو زبان ہے جو دہلی کے ان شرفا اور سرداران فوج کی زبان تھی جو اب برہانؔ الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی اور اس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آکے اپنا دیوان پیش کیا اور اپنے نغمۂ دل کش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے جگایا۔ اس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہوگیا اور دہلی میں اردو شاعری شروع ہوگئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے استادی کی شان سے دہلی میں داد سخن دینا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اردو زبان کی طفلی نہیں تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دنیائے اردو کے ان سابقین الاولین میں سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خانؔ آرزو تھے، جنھیں مولانا آزادؔ مرحوم نے دوسرے دور شاعری میں رکھا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سوداؔ، میرؔ، مرزا مظہر جان جاناںؔ

اور خواجہ میر درد شامل ہیں، سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زبان دانی کی لکھنؤ میں آنے کی بنیاد ان ہی استاد اوّل خان آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے انھیں لکھنؤ بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزیں رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (۱۱۸۴ھ محمدی مطابق ۱۷۵۲ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ گزار آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استاد اردو شاعری کے تھے اور ان ہی سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ ان کی ہڈیاں سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپی گئیں۔

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی استاد سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے، قدردانی کی "تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا۔ مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیف سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا۔ جب کہ خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اس کی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہیں کا ہو یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا،

میر تقی میر، سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دور کے پیمبران سخن ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ آئے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اس کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران، خواجہ حسن حسن، میرزا فاخر مکین۔ میر ضاحک۔ بقار اللہ خاں بقا۔ میر حسن دہلوی، میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور ان ہی کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدین منت۔ میر ضیار الدین ضیا۔ اشرف علی خاں فغاں دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے۔ مگر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے کلکتے اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ ان کے وطن نگینے میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔

صرف میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوش قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلا۔ یہیں عروج پایا اور یہیں مر کھپ گئے۔ اس دور

کے رکن رکین جرأت - سید انشا - مصحفی - قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبانِ مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے، اس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اس عہد کے ایک شریف وضع دار بڈھے اور نوراً نام ایک کسبی کی نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں۔ مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نوراً کہتی ہیں "اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھے تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں[1] میں نہ چلو۔ تمھیں علیؑ کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔" اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہیں اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیاں کی ہیں جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اس زمانے میں شرفا و کملا درکنار رنڈیاں تک لکھنؤ میں آ کے بستی جاتی تھیں اور جو لوگ دلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے، اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی اور

---

[1] لکھنؤ کے ایک میلے کا نام۔

لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کرکے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ ناانصافی ہے۔ اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورات ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں اور اس زبان کی بنا پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلم رو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر۔ صبا۔ رند۔ گویا۔ رشک۔ نسیم دہلوی۔ اسیر۔ نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا اور دہلی میں مومن، ذوق، اور غالب نغمۂ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد ساتواں دور امیر۔ داغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

فارسی شاعری کا اصلی اٹھان مثنوی سے ہوا ہے اور یہ صنف شاعری

ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہ نامے سے پڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانائے روم۔ خسرو۔ جامی اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت ونام وری حاصل کی۔ اردو میں میرتقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا، جو بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کا نشوونما ہوا تھا۔ یہیں پرورش پائی تھی اور یہیں کی آب و ہوا کے آغوش میں ان کی شاعری پلی تھی۔ کیوں کہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان کی مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے میں مرزا محمد تقی خاں ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی اور لکھنؤ میں مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق ابھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل زار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق۔ زہر عشق اور فریب عشق لکھیں اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذت عشق نام ایک مثنوی لکھی تھی۔ وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے ان ہی کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ اُن کی ہے اور

نہ ان کے زمانے کی ہے۔

ان سب مثنویوں کو دیکھتے ہوئے مثنوی گل زار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نو مشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات، استعارات اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی اور گل زار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس پر غالب نہ آسکی۔ دہلی میں ان دنوں مومن خاں نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خاں کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو متشخص کر کے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خاں کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا اور ان کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں اور نظم اردو میں جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لا کے کھڑے کر دیے۔ ادھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامہ

شگفتنقیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو پبلک کے سامنے پیش کردی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خاں کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گل زار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گل زار نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بنجارے نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسم الفت کا اور اگر گل زار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گل زار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں۔ بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لئے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کم زور پڑ گئی تھی۔ لیکن بہ عہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہلبیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لئے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسین میں دو ایک مرثیے

بھی موزوں کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدردانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنھوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا اور فارسی معاشرت ان کی امیرانہ زندگی اور ان کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا۔ اس لئے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے ان کے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا اور ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

غرض سوداؔ و میرؔ کے زمانے میں میاں سکندرؔ۔ گداؔ۔ مسکینؔ اور افسردہؔ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت امام حسینؑ کے بیان میں

تصنیف کرکے مجلسوں میں سنادیا کرتے۔ ان کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی اور مرثیوں کی موجودہ وضع ان ہی کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحب زادے میر انیس کو نام وری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھلائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہ تاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا، اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی بلند خیالی اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبدء فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھادیا اور ادب اردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کردیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈھنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجائے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معترف و مداح ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ اور ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی تھی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنادیا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لئے خاص خاص کوششیں کی تھیں

اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے ۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیسؔ نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیسؔ کے گھرانے کی ایجاد ہے، جس کی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں ۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لئے اگر ان باکمالوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں ۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو میں بھی اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی ۔ سنسکرت میں اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر ان سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل نا آشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اردو شاعری کو ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے المپیا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں مذہبی اسٹیجوں پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دل چسپی پیدا ہو گئی اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی

رماتے اور بہت سی عورتیں، پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لئے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانتؔ نے جو ایک مشّاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں ان کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں، جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دل کش دھنیں قائم کی گئیں اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ میاں امانتؔ کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور اور لوگوں کو بھی شوق ہوا اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے سب کا نام "سبھا" قرار پا گیا۔ چنانچہ شہر میں مداریؔ لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دل کش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور تماشے کی دل فریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد

ہو کے مروج ہوا ٹھاٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ ان کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سپیرے، ہریش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں پر فارمنس ہو رہے ہیں اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی مذاق اٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہیں۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں اور ان کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار، اس کے بعد معشوق کا سراپا، اس کی بے وفائیاں، پھر اس سے روٹھ کے اسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا۔ چھیڑنا۔ جلی کٹی سنانا اور یوں اس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانۂ وسط کے قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کئے ہیں۔ دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خاں نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

امرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پر لطف ریختی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں

جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کے کلام کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گذری ہوئی بے حیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک سے صاحب قرانؔ تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے اور یہیں چمکے۔ ان کا نام سید امام علی تھا اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے بتذل مذاق والے رئیس زادوں میں ان کا نشوونما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور میں میاں مشیرؔ نے جو مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سنیوں کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تولا، یعنی اہلبیت کرامؑ اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت اور دوسرا تبرا یعنی اس خاندان محترم کے دشمنوں سے اپنی برأت ظاہر کرنا، جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب و شتم کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے میں سنی بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینوں جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیاء و رسل اور سچے جانشینان رسالت مانتے ہیں اور

شیعہ ان کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں اور جب یہ بزرگ بھی ان کے عقائد میں خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو ان سے بھی تبرا واجب ہوگیا جس کو مہذب اور صاحب علم لوگوں نے اگر حرف برات کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق ان پر زبان سب و شتم دراز کرنے لگے اور یہی چیز سنی شیعوں کے باہمی تعصب کی بنا قرار پاگئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنو کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تولاّ نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جملہ اصناف شاعری سے بڑھا دیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پرانی ہجوگوئی کو اختیار کرکے اسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد باکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہل سنت کو ناگوار گذرنے والی تھی۔ عہد شاہی میں اس پر تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمہ بازیاں ہوجایا کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی و ہرزیہ خوانی کو مکانوں کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گویوں نے اپنی بے ہودہ گوئیوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیرؔ کے شاگرد میاں مشیرؔ کو حاصل ہوئی۔ ہجوگوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی۔ مگر "مشیرؔ" نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا، بندش الفاظ، طرز ادا اور استعمال تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور

سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لئے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے اسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا ان کا خاص جوہر تھا جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں میاں چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانۂ وسطیٰ میں عاشور علی خاں نام کے ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ ان کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ ان ہی نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان ہی کی صحبت میں صاحب قران کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر میں پیشاب یا خانے کی رعایت رکھتے اور ان کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہوں گے۔ مگر چوں کہ ان کو ایک قسم کی خصوصیت تھی، ہم نے ان کا ذکر کر دیا۔ ان کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں مگر ان کی مذاق نے ان خوبیوں کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رساں نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے، مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانوں میں یہ امتیاز موجود ہے، مگر اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔

فارسی اور عربی کا پرانا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لئے ان کی زبان اختیار کر لیتے۔ یہی حال انگریزی کا ہے۔ اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی۔ یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں تو مرد بن کے کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لئے ضمیریں تک مذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانوں میں خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسنؔ نے اپنی مثنوی میں ضرورت کے موقعوں پر یہ زبان موزوں کی تھی۔ مگر وہاں تک مضائقہ نہ تھا۔ میاں رنگینؔ نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداً مہذب لوگوں کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشاؔ کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک رنڈی نوراؔ کی گفتگو لکھی ہے اس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں " اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ رنگینؔ تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسنؔ پر زہر کھایا ہے، ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں بھلا

اس کو شعر کیوں کر کہیے؟ سارے لوگ دلی کے، لکھنؤ کے، رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی | کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اس بے چارے رنگینؔ نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن بے چارہ برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا؟ اور شہدپن مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمی کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے؟

ذرا گھر کو رنگینؔ کے تحقیق کرلو | یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہار

مرد ہو کر کہتا ہے۔ ع۔ "کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں" اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے۔ جس میں اوپر والیاں چلیں۔ اوپر والا چاند۔ اجلی دھوبن وغیرہ وغیرہ ہیں۔"

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگینؔ کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا اور ریختی اُردو کا ایک فن ہوگیا۔ جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسنؔ کے بعد نواب مرزا شوقؔ نے جس اعلیٰ درجۂ کمال کو پہنچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جایئے، یہی نہیں پتہ چلتا کہ موزوں کرنے میں شاعرانہ ضرورتوں نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن غزل گوئی میں رنگینؔ کی جانشینی جانؔ صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک

معمولی شخص تھے اور عاشور علی خاں کی خراد پر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے ، مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے غزلیں کہیں واسوخت کہی اور اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بد کاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاک دامنی کے جذبات اختیار کئے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بد کاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لئے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

رنگے سیار

(رتن ناتھ سرشار)

اب اس فرح بخش و دل کشا مقام ندرت التیام کا ذکر سنیے۔ چوطرفہ کھائی کھدی ہوئی ہے، آٹھ آٹھ گز گہری۔ سرپت ارد گرد بوئی ہے۔ ایسی گھنی کہ چڑیا تک کا گذر نہ ہو سکے اور وہ تیز کہ تلوار گرد۔ بڑا عالی شان محراب دار پھاٹک لگا ہوا ہے۔ وہ جوہر دار شیشم کی لکڑی کہ باید و شاید۔ کیاریاں روز سینچی جاتی ہیں۔ روشوں پر سرخی کٹی ہے۔ اشجار پر بہار گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کہیں انار کی قطار۔ کہیں لکھوٹ کی بہار۔ ادھر انبہ لذیذ و شیریں۔ ادھر ہاتھی چنگھاڑ۔ امرود حلوائے بے دود۔ چکوتروں اور مہتابیوں سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی ہیں۔ نارنگی اور چکوترا میٹھے شاخوں پر لدے ہیں۔ پھولوں کی بو باس۔ کہیں گل مہندی کہیں گل عباس۔ نواڑی پھولی ہوئی۔ چوطرفہ عالم نور ہے۔ ہر سمت لطف موفور ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اودی اودی گھٹا، کلیوں کی چٹک، جوہی کی بھینی بھینی مہک، کلغے کی دہک، کنیل کی دمک، وسط باغ میں ایک تین فیٹ کا اونچا پکا مربع چبوترہ بنا ہے اور ایک کونے میں چھوٹا سا خوش نما بنگلا ہے۔ اغل بغل دو ایک صاف ستھری کوٹھریاں،

یہ تو سب کچھ ہے مگر مکین کا پتہ نہیں۔ اس سیم تن کی چال ڈھال اور طرز نشست سے اجنبیت برستی تھی۔ حیرت تھی کہ اس باغ لطافت بار کے مکین سلیقہ شعار کہاں چھپ رہے۔ ؎

باغ ہے پر عجب ہے یہ روداد　　نہ کہیں آدمی نہ آدم زاد
گل ہیں سب اپنے اپنے جوبن پر　　بوئے گل ہے صبا کی توسن پر
ہے عجب لطف پر شگوفہ و گل　　کہیں سنبل کھلی کہیں سنبل

انھوں نے دیکھا کہ بت طناز سرمایۂ ناز آفتابہ کو زمین پر ٹیک کر ایک نواڑ کی نازک پلنگڑی پر سو رہی ہے۔ اب تو ان کو خوب ہی موقع ملا۔ اٹھے اور میوۂ تر جس قدر جی چاہا خوب چکھ کر کھایا اور آفتابہ کو منہ سے لگایا تو ایک ایک قطرہ پی گئے۔ پیٹ بھرا تو دور کی سوجھی۔ جان پر کھیل کر کف پائے نگاریں کا بوسہ لے ہی لیا۔ ؎

تو بہ خواب ناز بودی کہ من از رقیب پنہاں
کف پات بوسہ دادم ز حنا شنیدہ باشی

اتنے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میاں آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے، مگر تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں ہے کون۔ دیکھا تو پھاٹک کی جانب سے کوئی آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ قریب آیا تو انھوں نے بہ غور نظر ڈالی۔ ایک کشیدہ قامت، لحیم و شحیم ڈنڈ بیل، چٹ لنگوٹ باندھے اکڑتا اینڈتا اس بنگلے کی طرف جاتا ہے۔ سمجھے کہ کوئی پہلوان کشتی گیر اپنے اکھاڑے سے واپس آتا ہے۔ قریب آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہیں۔ وہ چٹ لنگوٹ جس سے پہلوان کا دھوکا ہوا تھا تہ بند نکلا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے۔

سیم تن کو پلنگڑی پر سوتا پایا۔ ایک دفعہ ہی پلنگ پر ہاتھ مار کر چلا اٹھے (اٹھ خصم معبود)۔ وہ زن رعنا شمائل گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اٹھتے ہی قدم لئے۔ شاہ جی نے فرط شفقت سے اس کی جبین نورانی اور جبین پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک تپائی پر بیٹھ کر یوں تقریر کرنے لگے۔

شاہ جی۔ بیٹی آج تم کو ہمارے بہ سبب بہت راہ دیکھنی پڑی۔ ایک گاؤں میں یہاں سے دس کوس پر راجہ رہتا ہے۔ مگر اسّی برس کا ہو گیا اللہ نے اسے لڑکا دیا نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا۔ میں کہیں کو آتا جاتا تو ہوں نہیں۔ وہ رانی کو لے کر آپ آیا قدم بوسی پر گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پر ایک گلاب کا پھول بن سونگھا دے مارا۔ پانچویں ہی مہینے اللہ نے لڑکا دیا۔ راجہ میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بٹھا لیا۔ کہتا ہے روپیہ لو۔ جاگیر لو۔ گاؤں لو۔ ہاتھی گھوڑے لو۔ مگر میں کب مانتا ہوں۔ اس وقت پیچھا چھوٹا۔ تم پانی لائی ہو گی تو میں پھونک دوں گا جس میں تم نامحرم نہ رہو۔

سیم تن۔ میں آپ کی لونڈی ہوں۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آفتابہ پانی کا بھرا ہوا وہ رکھا ہے۔ آپ پھونک ڈال دیں تو میں رخصت ہوں۔ یہ کہہ کر سیم تن اٹھی، دیکھا تو آفتابہ موجود مگر پانی نہ دارد۔ ایں یہ پانی کیا ہوا؟ زمین کھا گئی، آسمان کھا گیا۔ ابھی پانی رکھا، دیکھتے ہی دیکھتے اڑ گیا۔ ہے ہے شاہ صاحب آپ کے پاس میں جھوٹی بنی۔ میری بڑی کرکری ہوئی زمین پھٹ جائے تو میں دھنس جاؤں۔ اے لو غضب خدا کا ایک

بوند تک نہیں۔ اللہ جانتا ہے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی۔ بتا ہی دوں اچھا اب بے چین نہ رہو۔ سنو سنو۔ مجھے اشراق سے معلوم ہو گیا کہ تم آتی ہو۔ جب تم سو رہیں تو میں نے آنکھ بند کی اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا۔ پھر آنکھ بند کی اور راجہ کے پاس ہو رہا۔ پھونک ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے پر بات جاتی۔ اب تم یہ الائچی لو اور کل آدھی رات کو کسی مرگھٹ میں دفنا دو۔ بس مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سیم تن نے الائچی لی اور اسی دم واپس گئی۔ میاں آزاد چپ کے چپ کے سن رہے تھے۔ اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ آفتابے کا پانی تو انھوں نے پی لیا تھا اور شاہ صاحب نے معاً پٹی دی کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے اور پانی پی کر پھر کسی ترکیب سے چل دیے۔ یہ سن کر آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شاہ جی کی باتوں سے ان کے دل پر نقش ہو گیا کہ بڑے ہی ذات شریف ہیں۔ اتنا بڑا جھوٹا دیکھا نہ سنا۔ ایسے بڑے ولی اللہ ہو گئے کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں مہینے بچہ جن پڑی۔ اس کذب پر خدا کی سنوار۔ جھوٹ بھی تو کتنا اور عالم اشراق میں بھی حضور کو بڑا دخل ہے۔ چشم بد دور حق یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں مگر بیٹے بڑھائے۔ نہ بند باندھ کر شاہ جی بن گئے۔ لگے پجنے۔ کوئی بیٹا مانگتا ہے۔ کوئی تعویذ کا خواستگار ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میرا مقدمہ جتوا دو تو حق خدمت بجا لاؤں۔ کوئی کہتا ہے، فلاں عہدہ دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ اتفاق وقت سے مطلب بر آیا تو شاہ صاحب کی چاندی ہے۔ ورنہ مجال کس کی کہ شکایت کا لفظ زبان تک لائے۔

ڈر ہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک۔ بہت سے دشمنِ عقل ان بنے ہوئے فقیروں کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں۔ بعض بعض تو معاذ اللہ انھیں دوسرا خدا سمجھتے ہیں۔ خدا ایسے خیالاتِ مزخرف سے بچائے۔ میاں آزاد اس درویش معمر کی گفتگو سے سمجھ گئے تھے کہ پڑھے لکھے خاک بھی نہیں ہیں۔ ورنہ (بہ سبب) اور (نامحروم) نہ کہتے۔ بھلا ان پڑھ کندۂ ناتراش بھی مسلکِ خدا شناسی کے سالک ہو سکتے ہیں اور غیب کی بات تو جنابِ باری عزّ اسمہٗ کے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہ شاہ جی بے چارے کیا کھا کر بتائیں گے۔ ع۔ عالم الغیب کیست غیر از حق۔ یہ سب باتیں ہیں۔ ضعیف الاعتقاد آدمی ایسے جاہل مکّاروں کے بھرّوں میں آئیں تو آئیں۔ ہم بھلا کب پھنسنے والے ہیں۔ اے توبہ یہاں طفلی ہی سے فقیروں کے قائل نہ ہوئے اور ان شاہ جی نے تو کذب کے پل باندھ دئے۔ وہ بے چاری عورت ناقص العقل دنیا کے حالات سے واقف نہیں، جس کا جی چاہے بہکا دے ہم ایسوں کو شاہ جی چکما دیں تو ٹانگ کی راہ نکل جائیں۔

میاں آزاد کی کارستانی اور شاہ جی کی پریشانی

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن   ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ہمارے بگڑے دل ہیکڑ سودائی مزاج رنگیلے جوان میاں آزاد ایسے بنے ہوئے سدھے اور رنگے سیار فقیروں کی قبر تک سے واقف تھے معاً تاڑ گئے کہ شاہ صاحب ایک ہی مرشد، بڑے ہی استاد، چھٹے ہوئے گرگے، پاک شہدے ہیں۔ خرقۂ سالوس در بر اور عمامۂ زور بر سر۔ گوگھوں کو

پھانس پھونس کر ہنڈیا چڑھاتے ہیں۔ موہن بھوگ، حلوا پوری، قورمہ باقرخانی اڑاتے ہیں۔ ان پڑھ گنوار چنگ پر چڑھ جاتے ہیں۔ سوچے کہ شاہ جی کی قرار واقعی مرمت کردینی چاہیے۔ اتنے میں شاہ صاحب نے ایک صاف شفاف چبوترے پر لنگی بچھائی اور اس پر دراز ہو کر مناجات پڑھنے لگے۔ مگر پڑھے لکھے تو تھے ہی نہیں صرف حافظے پر پر دار مدار تھا۔ شین قاف تک درست نہیں۔ شاعری کا خوب دل کھول کر خون کیا اور اناپ شناپ بکنے لگے۔

خدایا جہاں بادشاہی تراست | نما خد بہ آمد آئی تراست
ہماں آفریدی بالا و بست | توئی آفریں ند آلا د گشت
توئی کا سماں راز میں ساکتی | زمین راز مان وزمیں ساکنی
بنائی زما جو بس بحر کردنی | دگر خفتنی باز آپی خوردلی
دوکان ست با فرد قرخندگی | خداوند ما از تو بندگی

شاہ جی بڑے سوز و گداز سے لہرا لہرا کر حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ والغفران کے کلام معجز نظام کا خون اپنی گردن پر لے رہے تھے کہ میاں آزاد سے نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ ہی بول اٹھے کہ (یا وحشت تیرا ہی آسرا ہے) اب تو شاہ جی چکر میں آئے۔ یہ آوازہ کس نے کسا۔ یہ حریف کون پیدا ہوئے۔ یہ پھبتی کس نے کہی۔ ادھر ادھر دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر آدم نہ آدم زاد۔ انسان نہ انسان کا سایہ۔ یاالٰہی یہ کون بولا۔ یا خدا یہ کس نے ٹوکا۔ سمجھے کہ یہ آسمانی ڈھیلا ہے۔ خدا کھوپڑی کو بچائے۔ ڈرپوک ضعیف الاعتقاد تو تھے ہی ڈرے کہ کوئی بلائے ناگہانی یا آفت آسمانی ہے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بدن تھر تھرانے لگا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

کشف و کمال سب بھول گئے۔ حواس بلا اجازت سپاٹو پر ہو رہے۔ ہوش قلابازی کھانے لگے۔ دفع بلا کی آئتیں پڑھنا شروع کیں۔ آخر میں بہ آواز بلند چلا اٹھے کہ (یا مظہر العجائب) ادھر یہ بول اٹھے (لنگی مع شاہ جی غائب)۔ اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ چہرے پر مردنی چھاگئی۔ ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ دم بہ خود۔ میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھاگیا۔ جھٹ نکل کر پتوں کو خوب پاؤں سے کھڑکھڑایا۔ شاہ جی کانپ اٹھے کہ پریتوں کا لشکر آن کھڑا ہوا۔ اب گئے ہی گذرے۔ آزاد نے بہ لحن داؤدی خاص اہل عجم کے لہجہ میں ایک غزل پڑھی۔

گو شاہ جی الف کے نام بے بھی نہیں جانتے تھے مگر رات خوب ہی بھیلی تھی اور چاندنی نکھری تھی۔ ہوائے سرد پھولوں کی بو باس کو منتشر کر رہی تھی۔ آزاد نے ایسی سریلی آواز سے اس حقانی غزل کو گایا کہ کندۂ نازاش تک کو وجد آیا۔ شاہ جی مست ہوگئے۔ سمجھے کہ کوئی درویش باکمال آنکلے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لئے۔ انھوں نے پیٹھ ٹھوکی۔ شاہ جی اس وقت دو آتشہ اڑائے ہوئے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اترا ہے۔

آزاد۔ کیستی واز کجائی و بامنت چہ کار ست؟ سکوت تا کے! ما اسمک انت شیخ او سید۔

بلغنا المراد وزال العنا لک الحمد والشکر یا ربنا۔ اللہ بس باقی ہوس۔ شاہ جی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہوگئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی۔ سمجھے کہ بے شک فرشتۂ آسمان ہے۔ ہماری روح قبض کرنے

نازل ہوا ہے۔ دبے دانتوں گڑگڑاتے ہوئے فرماتے کیا ہیں، ہیں علم سے نامحروم ہوں گا۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ اس وقت کیا حکم دیتے ہیں۔ ہم نے بہت گناہ کئے۔ اب ماف (معاف) فرماؤ۔ کچھ دن اور جینے دو تو توبہ کروں کہ ٹھگ بدیا چھوڑ دوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ فرشتے ہو، روح قبض کرنے آئے ہو۔ لا علم

آزاد۔ پیرانہ سالی اور یہ بد اعمالی۔ یہ سن و سال اور یہ چال ڈھال۔ یاد رکھ کہ قعر جہنم میں پھینکا اور نار دوزخ میں جلایا جائے گا۔ سن میں فرشتۂ آسمانی نہ ملک نورانی۔ میں حکیم بلیناس کی روح پاک، عالم ہوں۔ حکیم ہوں۔ خدا ترس ہوں۔ رحیم ہوں۔ ملکوتی صفات ہوں۔ صاحب طلسمات و نیرنجات ہوں۔ شجاعت میں رستم سیستانی۔ حکمت میں ارسطوئے ثانی۔ مصوری میں رشک بہزاد و مانی۔ سکندر نامہ میں نظامی نے یہ شعر میری ہی شان میں کہا ہے۔ ؎ نام کتاب

بلیناس فرزانہ را پیش خواند　　　به نزدیک جام جہاں بیں نشاند

میری تعریف و توصیف میں بڑے بڑے شعرائے بلند پایہ و سخن ورانِ گراں مایہ رطب اللسان ہیں۔ میرا مزار اسی جگہ پر تھا جہاں تیرا چبوترہ ہے اور جہاں تو ناپاک رہتا تھا اور شرابیں لنڈھاتا تھا۔ خیر۔ تیری ناواقفیت کے سبب سے تجھے میں نے چھوڑ دیا۔ لیکن اب آپ نے یہ نیا ہتھکنڈا سیکھا کہ اس زنان جادو جمال زہرہ تمثال کو پھانسا اور اس سے کچھ اینٹھنا چاہتے تھے۔ وہ اس زمانے میں میری منکوحہ اور مطبوعہ بیوی تھی۔ لے اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ کر دریا سے منہ موڑ۔ ورنہ تم ہو اور ہم۔ ابھی ابھی ٹھیک بناؤں گا اور ناچ نچاؤں گا۔ مفر اسی میں ہے کہ اپنا کل حال

لا رہائی، جھگڑا

پوست کندہ راست براست بے کم و کاست کہہ چلو۔ نہیں خود ہی بھگتوگے، میرا کچھ نہ جائے گا۔ شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی بیتی صاف صاف کہہ سنائی۔ جس کو ہم اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں ذرا کان دھر کر سنئے۔

شاہ جی۔ چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کی لت پڑی۔ وہ مشاقی بہم پہنچائی کہ آنکھ چوکی اور گٹھری اڑائی۔ غافل ہوا اور ٹوپی کھسکائی۔ پہلے کچھ دن تو لوٹیا چور رہے۔ مگر یہ تو کرتی بدیا ہے۔ چند ہی روز میں چوروں کے ولی کھنگڑ ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے۔ کمند پر چڑھنا کوئی ہم سے سیکھے۔ چھت کی کڑیوں میں یوں چمٹ رہوں جیسے چھپکلی۔ اچک پھاند میں بندر میرے مقابلے میں گرد ہیں۔ دبے پاؤں کوسوں نکل جاؤں، ممکن کیا کہ کسی کو آہٹ معلوم ہو۔ شہر بھر کے بدمعاش۔ اوباش۔ لقے۔ لچے۔ شہدے۔ گرگے ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ بڑے بڑے مہاجن ساہوکار جھک کر سلام کرنے لگے۔ جس نے ہیکڑی کی لی اس کو نیچا دکھا دیا۔ جو ٹیڑھا ہوا اس کو سیدھا بنایا۔ خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا کل اس کی چھت کاٹی۔ پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیند دی۔ رفتہ رفتہ ڈاکے مارنے لگے۔ سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ ٹھانگ میں دنیا بھر کے بے فکرے جمع ہیں۔ ایک طرف یاران سرپل چانڈو اڑا رہے ہیں۔ دوسری طرف چرس کے دم لگا رہے ہیں۔ گانجا بھنگ بھرے سب کا شغل ہے تانیں اڑا رہے ہیں۔ شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ گنڈیریوں کے انبار لگے ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں۔ سب کو یہی فکر ہے کہ کسی کا مال تاکیں۔

کوئی زردار کورا نہ بچ نکلے۔ داغی ضرور ہو۔ ایک دن شامت اعمال سے ایک نواب صاحب مقدرت کے ہاں چوری کرنے کا شوق چرایا ان کے خدمت گار کو ملایا۔ ماما چھوچھو کو کچھ چٹایا۔ ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اسی محلے میں ایک مہینے قبل مکان کرایہ پر لیا۔ اسی مکان میں بیٹھے۔ نواب کا ایوان عالی شان کوئی پچاس ہی قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ تین آدمی دس قدم پر اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے۔ ہم اور خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑیں۔ قریب گئے تو ڈیوڑھی پر چوکی دار نے پکارا۔ کون۔ سن سے جان نکل گئی۔ عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکی دار کو پہلے سے نہ ملالیا۔ اب کیا کریں۔ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد۔ قہر درویش بر جان درویش۔ پھر چوکی دار نے للکارا کون آتا ہے۔ ہم نے کہا ہم ہیں بھئی (چوکی دار) ہم کی ایک ہی کہی۔ ہم کا کچھ نام بھی ہے۔ آخر کار ہم نے چوکی دار کو اسی دم کچھ چٹا کر سیند دی۔ گھر میں گھسے تو دیکھتے کیا ہیں کہ نواب صاحب پلنگ پر سوتے ہیں اور ان کی بیگم دوسرے پلنگ پر خواب ناز میں ہیں، مگر شمع روشن ہے۔ اپنی ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع گل کردے۔ اتفاق وقت سے وہ ایسا گھبرایا کہ بڑے زور سے پھونک ماری۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے۔ ایسا نہ ہو کہ نواب جاگ اٹھیں تو لینے کے دینے پڑیں۔ آگے بڑھ کے میں نے بتی کو تیل میں کھسکا دیا۔ چلئے چراغ گل پگڑی غائب۔ بیگم صاحب کے سرہانے زیور کا صندوق رکھا تھا۔ مگر آڑ میں۔ ہم تو ماما کی زبانی کچا چٹھا سن چکے تھے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ فوراً صندوق اٹھایا اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر پہنچائے وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ مارے

بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا اور ایک دفعہ ہی اراراکر دھم۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی نواب چونک پڑے۔ شیر بچہ سرہانے سے اٹھا پلنگ سے اٹھ پیترے بدل بدل کر پھکیتی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور جھٹ کمرے سے نکل دیوار پر چڑھ پچھواڑے کود اور چور چور پکارتا ہوا نا کے باہر۔ وہ دونوں سر بوجھے تو سیکھے تھے دھر لئے گئے۔ گر واہ رے نواب واللہ جری آدمی ہے۔ دونوں کو گھیر لیا۔ وہ تو جیل خانہ گئے بندہ نلوہ بچا۔ اب ہم نے یہ پیشہ چھوڑا اور سفاکی پر کمر باندھی۔ ایک مہینے میں تین خون کئے۔ پہلے ایک سوداگر کو گھر میں گھس کر چارپائی پر ڈھیر کر دیا اور جمع جتھا ہمارے باپ کی ہو گئی۔ پھر ریل پر ایک مالدار جوہری کا گلا گھونٹ ڈالا اور جواہرات صاف اڑا لئے۔ تیسری دفعہ دو بنجارے سرا میں اترے تھے۔ ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں۔ ان کو سرا ہی میں انٹا غفیل کرنا چاہا۔ بھٹیارن نے ہمیں دیکھ لیا۔ غل مچایا پکڑے گئے۔ چالان ہوا مجسٹریٹ نے قید خانہ دکھایا۔ آٹھ دن رہے تھے کہ نویں دن آزادی یاد آئی۔ رات کو موقع پاکر کال کوٹھری کا دروازہ ایک کنجی بردار کا سر اینٹ سے پھوڑا۔ پہرے کے کانسٹبل کو اسی کی بندوق سے شہید کیا۔ صاف نکل بھاگے۔ اب ہم سوچے کہ کوئی نیا پیشہ اختیار کریں۔ اس گاؤں میں آئے تو عجب ہتھکنڈے سے درویش باکمال بن بیٹھے۔ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک پیڑ کے نیچے بستر جما دیا۔ پجنے لگے کہ ایک دن اس گاؤں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا۔ یہاں طبیب نہ ڈاکٹر۔ کسی نے کہہ دیا کہ ایک ولی اللہ پکریا کے نیچے بیٹھے یاد خدا کیا کرتے ہیں۔ چہرے سے نور برستا ہے۔ کسی سے لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے

ہی اپنے بھائی کو بھیجا۔ ہم ساتھ گئے۔ چہرہ بشّاش کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا تو عمر بھر چین سے گذرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے (قدم درویشاں رد بلا) بہ آواز بلند کہہ کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا کہ لڑکے کا برا حال ہے۔ بچنا محال ہے۔ ٹھاکر قدموں پر گر پڑا ہم نے پیٹھ ٹھوکی اور لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے چل دئے۔ اسی دن حسن اتفاق سے ایک یوروپین ڈاکٹر دورہ کرتے ہوئے اس گاؤں میں آئے اور ان کے معالجے سے مریض چنگا ہو گیا۔ اب لطف دیکھیے کہ ڈاکٹر کا تو کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ کوئی عیسیٰ بتاتا ہے۔ کوئی خدا رسیدہ کہتا ہے۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپیہ دیا۔ وہ ہم نے قبول نہ کیا۔ سبحان اللہ پھر تو ہوا بندھ گئی۔ اب چو طرفہ ہم ہی ہم ہیں۔ کوئی بیمار ہو تو ہم پوچھے جائیں۔ کوئی مرے تو ہم بلائے جائیں میاں بیوی کی شکر رنجی میں ہم قاضی بنتے ہیں۔ باپ بیٹے کا جھگڑا ہم فیصل کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں اور نعمتوں پر نعمتیں ہمارے سامنے چنی رہتی ہیں۔ عورت، مرد، غریب و امیر برنا و پیر سب زیارت کو آتے ہیں۔

ہمارے آزاد منش بے باک روش، پاکیزہ مشرب، عالی گوہر فرخندہ اختر، معزز و ممدوح میاں آزاد اب حکیم بلیناس فرزانہ کی روح بن بیٹھے۔ بھئی واللہ کیا کیا فقرے یاد ہیں۔ اچھا روپ بدلا۔ واہ استاد کیا کہنا ہے۔ بابا قدم لے، شاہ جی کو وہ گیدڑ بھبکی بتائی کہ آئے حواس غائب ہو گئے۔ شراب کے نشے نے سمند وحشت پر ایک در کوڑا جمایا۔ شراب

مکر و زور کا سارا حال مو بہ مو کہہ سنایا۔ واللہ اچھا سہل نسخہ ہاتھ آیا۔ شاہ صاحب کی قلعی کھل گئی۔ سچ ہے ہر فرعونے راموسیٰ۔ گانوں بھر چرکا کھایا تھا۔ خوب دام تزویر پھیلایا تھا۔ اب پھنسے بچہ جی۔ ہات تری ہیں خدا۔ میاں آزاد نے جب دیکھا کہ مارے بوکھلاہٹ کے ان کی بن آئی ہے تو تشفی دی اور یوں سمجھایا۔

آزاد۔ سنو شاہ جی! ہم تمھیں چر غٹو کئے بغیر نہ چھوڑیں گے، نہ چھوڑیں گے۔ ہم سے بھاگ کر تم جاؤ گے کہاں۔ ساری خدائی سے تو ہم ڈھونڈھ نکالیں۔ سمک سے سما اور ثریٰ سے ثریا تک اپنا راج ہے لیکن ہماری بیعت لاؤ، ہمیں اپنا پیر بناؤ تو چھوڑ دیں۔ اس وقت تو مزے سے پانوں پھیلا کر سو رہو۔ کل تڑکے گجر دم گانوں بھر میں غلغلہ ڈال دو کہ ہمارے پیر مقدس نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مگر ہمارا سن دو سو گیارہ برس کا بتانا اور سب سے کہہ آنا کہ ابھی نام خدا سبزہ آغاز اور جوان طناز ہی معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ جی کی باچھیں کھل گئیں کہ چلو کسی طرح جان تو بچی۔ نور کے تڑکے تمام گانوں میں اس سرے سے اس سرے تک پکار آئے کہ ہمارے مقدس پیر آئے ہیں۔ جسے دیکھنا ہو دیکھ لے۔ شاہ جی کی تو وہاں دھاک بندھی ہی تھی۔ جب لوگوں نے سنا کہ ان کے بھی دلی کھنگرہ آئے ہیں تو شوق چرایا کہ زیارت کو چلیں۔ دو دن اور دو رات میاں آزاد نے کسی کو رخ تاباں نہ دکھایا۔ تیسرے دن فقیرانہ لباس پہن کر ہرے ہرے پیڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایہ میں آن بیٹھے۔ میاں آزاد گل فام و نازک اندام حسین و مہ جبین تو تھے ہی، شنجرفی بند اور شنجرفی پیرہن نے

آتش حسن کو اور بھی بھڑکا دیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پو پھٹتے ہی زن و مرد غریب و امیر برنا و پیر زیارت کو آرہے ہیں۔ ٹھٹ کے ٹھٹ جمع۔ ہندو اور مسلمان کی عورات جوان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ جوان کم سن جادو جمال زہرہ تمثال شوخ و طنّاز، خوش انداز۔ سراپا ناز زیور سے مزیّن۔ لباس گراں بہا سے مشین چھمّا چھم کرتی چلی آتی ہیں۔ دس دس کوس سے فنسوں پر سوار بصد شوق زیارت آئی ہیں۔ نمکین طرح دار مہریاں ساتھ بانکی ادا سے فنس کے کونے پر ہاتھ، کوئی بڑے ٹھسّے سے ڈولی پر کوئی پیادہ پا۔ غنچہ کھلا ہوا ہے۔ میاں آزاد نے دل ہی دل میں ان کے ورثا کو خوب صلواتیں سنائیں کہ فقیر اور باکمال کا نام سنتے ہی کیا جھٹ سے بھیج دیا۔ خدا کی مار۔ شیطان کی پھٹکار۔ ان کو اپنی عقل بھی نہیں ہے کہ ذرا دل میں سوچیں کہ ہم بھیجتے کہاں ہیں؟ الٰہی توبہ الٰہی توبہ۔ میاں آزاد نے نہایت جوش و خروش اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ اشعار اور آیات پڑھنا شروع کیں اور خوب ہی بنے۔ بھئی واللہ کیا بھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ جس نے کپڑے رنگ لئے وہی خدا رسیدہ بن بیٹھا۔ دنیا بھر کے بے فکرے فقیر کے لباس میں مال مارتے ہیں اور اکثر تربیت یافتہ ثقات مسن تک ان کے باکمال ہونے پر گنگا اور قرآن اٹھاتے ہیں۔ کوئی ذی عقل سمجھائے تو الٹی آنتیں گلے پڑیں۔ ؎

خیانت سے مکائد سے دغا سے   خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

V. V. Imp.

آیندہ زمانہ میں اردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ الثانیہ" (یعنی دور جدید) ہوگا، جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعۂ خودرو تھا، منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب قریب پہونچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکّہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمی محفل کے لئے چند مصرعوں کی پیوند کاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبک دوش کر دیتی تھیں، لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیّر مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں، کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیّر حالت کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں مؤثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رو

ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی!

اس کش مکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقاتِ ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں، صرف یہ سمجھ لیجیے کہ بوسیدہ اور فانی اجزا کی جگہ قوی تر عناصر نے لی اور اقلیم سخن کی شریف تر ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اردو سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفۂ ادب ہوگیا۔

میری غرض لائق عزت سرسید[1]، پروفیسر آزاد[2]، نذیر احمد[3]، حالیؔ[4]، و شبلیؔ[5] سے ہے، جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہوگئی کہ السنۂ یوروپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدما (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا، جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چوں کہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اس لئے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں میری غرض لائف نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں جس میں بہ لحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لایق ہے۔ یہ انھیں کے قلم کی

آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لیے دلیل راہ بنی۔ آج جو خیالات بڑی آب وتاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کیے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں ورنہ پہلے یہ جنس گراں باوصف استطاعت اچھے اچھوں کے دست رس سے باہر تھی۔ سرسید کے کمالات ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھ کر منحرف طبائع کو بہ وساطت سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے، لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالاں کہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی نئی گردن پر ہیں؛ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے، اور اس کے لیے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ تر موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ نذیر احمد کو میں "شمس العلماء مارہروی" توبہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں جنھوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شائع کی ہے، باستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا 'یہ لکھیں گے اور ہم دردانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے' اسی کی ضرورت ہے۔ نذیر احمد گو ایک حد تک "عقلیات" سے رسیاں تڑاتے رہے لیکن ادب اور "منقولات" سے متعلق جو دفتر انھوں نے چھوڑا ہے، وہ اس قدر اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان،

وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدّت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجئے، اردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالبؔ کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیوند کاریاں جو ان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ نقل سے خالی نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدّت اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جو ان کے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرز ادا (اسٹائل) پر جو شارع عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے، کوئی اثر پڑتا ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغایرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا، پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجایش ہے، ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ با وصف کمالات علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمایش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایت فن یہ اپنی نادرالکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ، جس میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریع مسائل اور فلسفۂ استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے۔ یہی حد فاصل ہے جو شبلی سے قلم رو سے ان کے دائرۂ کمالات کو جدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوع سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشاپردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زور بیان کا قصور ہے، جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کرسکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لائق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں، جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوگئی، مگر ان کا حصۂ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لئے

جس قدر سرمایۂ علمی انھوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے، دائمی جدائی کے بعد، ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہے۔

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں، لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں ایک چچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوب صورتی سے فوری انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیے جائیں، یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے، جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات و مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح کا "تذبذب فی الرائے" نہیں ہے خالص یک رنگی ہے، جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہیے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے یہ بیگانے نہیں ہوتے۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بہ لحاظ فن ساقط العیار ہے اور اس لائق

نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ "پرانی لکیر" کے شیدائیوں کا ہے جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوع اصلی کیا ہے؛ بھیڑوں کا ایک غول ہے، جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک راستہ پر پڑ لیا اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا، لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں، نہ ہم اس مجموعۂ روایات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں، جو پرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں، لطف اٹھانے کے لئے تیار ہیں، کیوں کہ یہ بھی ایک عیش ہے، صرف اتنا کیجئے کہ برے بھلے حالؔی کو جدید گروہ کی لایق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے۔

میرا خیال ہے حالؔی کے کلام پر مولوی عبدالحق کھل کر داد سخن دیں گے۔ یہ آج تک باوصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف "مقدمات" پر ٹالتے رہے، ان کا مصرف صحیح کچھ اور تھا۔ ان میں مادۂ اختراعی (اریجینلیٹی) خاصا ہے، مگر قوت فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی، حالاں کہ ان کا سلیقۂ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے۔ بہر حال ان کو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہوگی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجایش نہیں چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چوں کہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا اس لئے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا

رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنادیا۔

علی گڈھ کو انھوں نے چھوڑا اور ندوۃ العلما نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو۔ لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت الحکما" (لٹریری اکیڈمی) میں بھیج دوں جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بہ لحاظ ہم فنی ان کے یاران طریقت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرہ تحقیقات، اہل زبان کی سی فارسی، اس میں بھی شاعری کا ملکۂ راسخہ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائق رشک انشاپردازی وہ صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شعر العجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے، "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔

اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علحدہ کر کے دیکھیے، جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے۔

لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپے چپے سے لے دے شروع ہو گئی اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی

دیتی تھی بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں! صرف حاسدین کی کم نظری تھی۔ دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزش قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافت علم دیکھئے! شرر کو جو "شبلی" پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ وہ صاف صاف کہہ گذرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا شبلی کی وجہ سے تھا۔ اب وہ ایک جسد بے روح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

"نقاد" میں "تاریخ کا معلّم اول" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اس کی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ۔ جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف سے معرا کر کے دکھایا تھا جو مضمون نگار نے حسن عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو توجہ لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دل چسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا

سب سے آخر مگر دراصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ آزاد اس پایہ کے ادیب ہیں مگر ان کے دائرہ کے اور خلاقین سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگی زبان اور آزاد کا خاص انداز بیان ہے جس سے ان کی نثر عموماً زنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا، روانی آب سے زیادہ دل کش ہے۔ مگر اس سے زیادہ تر دل کش ہے کسی نازک خیال مصنّف کی مرصّع پیداوار دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بار طبیعت نہ ہو اور فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے میرا خیال ہے لایق ذکر خصائص میں سے ہے، جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے"۔ جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہو گا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی، لکھنؤ کے اختلافات تک

محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلاخوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفہ، لٹریچر سے بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔ اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہو گا۔

سرسید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلیؔ سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، حالیؔ بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن "آقائے اردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں، "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں "افسانۂ یاران کہن" سمجھئے۔

اس بحث کو اصل تنقیدی مضمون میں پھیلاؤں گا۔ یہاں افتتاحی حیثیت سے بھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعری جس کے "آدم" حالیؔ سمجھے جاتے ہیں، غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی۔ مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ ان کی دل کش تصنیفات کے ان اجزا کو ابھار کر دکھاؤں گا، جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے۔

بہر حال ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے۔ اکبری نورتن کے

مقابلہ میں بعض مصاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی لیکن مجھے افسوس ہے کہ "مصنفین کی صف اول" میں اس سے زیادہ گنجایش معلوم نہیں ہوتی، تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علٰحدہ ہوکر اگر کوئی صاحب (بہ شرطے کہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکیں، تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لیے ایک حد تک تیار ہوں۔

اس تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم سو صفحے ہر مصنف کے نذر کئے جائیں۔ اس طرح پانسو صفحوں کی ایک کتاب تیار ہو جائے گی جس کا ایک طبع خاصہ (یعنی ایڈیشن ڈی لکس) بہتر سے بہتر کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شایع ہو گا۔ جس میں مصنفین کے ساتھ منقدین کی ہاف ٹون عکسی تصویریں شامل کی جائیں گی۔ اس کی تکمیل مالی امداد سے قطعاً بے نیاز ہے، صرف ضرورت ہے تو ترتیب مضامین کی جس کی طرف ایک مرتبہ اور میں ان اصحاب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کو فرداً فرداً میں نے نام زد کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔

طوفان حیات کا ایک ورق

(علامہ راشدی الخیری)

صادقہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اونچے گھر میں بیاہی گئی۔ ماں باپ کی چہیتی تھی، ساس سسروں کی عزیز ہوئی۔ میکے کی سرتاج تھی، سسرال میں راج کیا۔ تین سال شان دار زندگی بسر کرنے کے بعد پے در پے کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ امارت تو درکنار دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہا۔ انعام اس کے چچا زاد بھائی کو علم نہ تھا کہ ایک گھر پر حکومت اور خاندان پر سلطنت کرنے والی بیگم آج دو دو دانوں کو محتاج ہے۔ گھر پر جاکر آواز دی تو معلوم ہوا کہ گلی میں رہتی ہے۔ وہاں گیا تو ٹوٹی ہوئی کچی دیواریں اور پرانے کواڑ مصیبت ماری بہن کی غربت کا پتہ دے رہے تھے۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو ایک عورت نے دراڑوں میں آکر جھانکا اور کہا "اندر آجاؤ"۔ اندر گیا تو عجب سماں تھا۔ ماں باپ کی پیاری اور سسرال کی راج دلاری اس ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ میلے چکٹ کپڑے، جا بجا پیوند، چاروں طرف سے دوپٹہ سمیٹ کر اوڑھ کہ پاجامہ کے پیوند ظاہر نہ ہوں اور سلام کو جھک گئی۔ انعام نے تین برس بعد صادقہ کو دیکھا۔ اس کا اگلا

دور دورہ اور عروج آنکھوں کے سامنے تھا۔ کل کی بات تھی کہ گوندنی کی طرح زیور میں لدی، اعلیٰ اور نفیس لباس پہنے، تین تین چار چار مامائیں آگے، راج کر رہی تھی۔ آج وہ سماں کوسوں دور تھا اور اس عیش کی یادگار صرف وہ دیکھنے والے رہ گئے تھے جنھوں نے انقلاب کی اس تصویر کا اقبال اس طرح پامال ہوتے دیکھا۔ دولہا نے دو برس کا ایک بچہ گود میں تھا اور یہ ننھی سی جان خدا کی شان یاد دلا رہی تھی کہ جس کی پیدائش پر بیسیوں جوڑے غربا کو تقسیم ہوئے اب کڑکڑاتے جاڑوں میں صرف آفتاب اس کے جسم کو سردی سے بچاتا تھا۔ چاہتی تھی کہ پان بناکر بھائی کو دوں مگر خیال آیا کہ خود ہی شام سے خالی زردہ کھا رہی ہوں۔ پٹاری میں پان اللہ کا نام ہے۔ اس وقت صادقہ کی حالت عجیب تھی۔ ندامت کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ آنکھیں نیچی، زبان بند، ہاتھ پاؤں ساکت ایک بے جان جسم تھا جو سامنے کھڑا تھا۔ دو تین لمحے یہی حالت طاری رہی اور انعام نے کہا۔

"یہ تمھاری حالت میں کیا انقلاب ہو گیا۔ سید صاحب کہاں ہیں؟"

صادقہ ۔ "ان کا انتقال ہو گیا، مقروض تھے جو کچھ چھوڑا سب قرض میں چلا گیا"۔

انعام ۔ "مجھے تو اس کا علم ہی نہیں"۔

صادقہ ۔ "اپنی اپنی پریشانیوں میں سب گرفتار رہتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دوسروں کی پریشانیاں معلوم کرے۔ آپ کے ہاں سب خیریت ہے؟"

انعام ۔ "ہاں خدا کا شکر ہے کہ آج تمھاری بھابھی جان کی گود

بھرائی ہے۔ تمھیں لینے آیا ہوں۔"

صادقہ۔ خدا مبارک کرے میں نہایت خوشی سے چلتی لیکن اب میں اس قابل نہیں رہی۔ اتنا کہہ کر صادقہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر ضبط کیا اور کہنے لگی انشاءاللہ اور کسی موقعہ پر شرکت کی کوشش کروں گی۔

انعام۔" میرا جی یہ چاہتا ہے کہ تم آج ہی شریک ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے چلی چلو۔ ایسا ہی ہے تو شام کو چلی آنا۔"

صادقہ۔" دیر کا خیال نہیں ہے۔ کچھ اور سبب ہیں جن کی وجہ سے میں آج اس وقت مجبور ہوں۔"

انعام۔" تم یقین کرو تمھاری شرکت سے مجھے بے حد خوشی ہوگی اور تمھارا انکار مجھے اس مسرت سے محروم کرتا ہے جس کی میں تم سے توقع رکھتا ہوں۔"

صادقہ۔" حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے عمر بھر کی رفاقت کا وعدہ اور ہمیشہ ہمیشہ کی نباہ کا اقرار کیا تھا اس کی مفارقت میری تمام امیدوں کو ختم کر گئی۔ خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میرے دل میں اب کوئی ارمان باقی نہیں۔ ہاں میرے چلنے سے اگر آپ کو خوشی میسر آسکتی ہے تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ جس طرح بیٹھی ہوں چلی چلوں گی، مگر انعام بھائی تمھارے سسرال کے لوگ بھرے ہوں گے، میرے اس طرح چلنے سے آپ کی بے عزتی ہوگی۔ میرا خیال نہ کیجئے آپ اپنی عزت اور بے عزتی کو سوچ لیجئے۔"

انعام۔" کیا کہہ رہی ہو صادقہ! تمول اور ذلت انسان کے واسطے

وجہ عزت نہیں۔ تم تمام خاندان کے واسطے مایۂ ناز ہو کہ باپ دادا کی لاج اور بڑوں کی آن بان لئے بیٹھی عزت آبرو سے زندگی بسر کر رہی ہو۔ میں ڈولی لاتا ہوں۔ تمہارے چلنے سے ہمارا گھر منوّر ہو جائے گا اور یہ چھوٹی سی شادی یقیناً تم جیسی خاتون کی شرکت پر فخر کرے گی۔"

صادقہ اپنے بوسیدہ مکان سے چل کر بھائی کے ہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ عالی شان محل سرا بیویوں سے کھچا کھچ بھری ہے۔ سونے چاندی کے زیور، گوٹے پٹھے کے کپڑے، چاروں طرف جگمگا رہے ہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور زرق برق پوشاکوں نے گھر بھر کی رونق دو بالا کر دی ہے۔ صادقہ اس آرائش ظاہری سے قطعاً محروم تھی مگر اس کی روح مسرت حقیقی سے لبریز اور دل عارضی جلووں پر ہنس رہا تھا۔ بھاوج کی طرف سلام کو چلی تمام کپڑے میلے تھے، جواب تو مل گیا لیکن کوئی اور نہ ملا۔ بچہ کو لئے باہر انگنائی میں ایک پرانے تخت پر بیٹھ گئی۔ کھانے کا وقت آیا تو کیسی خاطر اور کس کی مدارات۔ کسی نے جھوٹوں بھی بات نہ پوچھی۔ بھاوج کی اس غفلت کا احساس فطرت تھی مگر اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ جب بچہ بھوک سے بے تاب ہو کر زیادہ بھڑکا تو بہلا کر سلا دیا اور خاموش ہو گئی۔ دن بھر مارا مار پیر جی کا جوڑا تیار ہوا۔ شام کو گود بھرائی ہوئی تو ہاجرہ کی بڑی بہن کی چار سال کی بچی کے دونوں دمکتے ہوئے سونے کے کڑے کسی نے صاف تیر کر دیئے۔ گھر بھر میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر بیس تولے کے کڑے سوئی تھوڑی ہی تھے کہ چھپ جاتے۔ دفعتہً پیر کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو سب بیویاں جدھر جس کا منہ اٹھا، کونے کھدروں میں جا گھسیں۔ پیر جی آئے تو

دسترخوان بچھنے کی تیاریاں ہوئیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا اور کہا۔
"میں تو صرف آدھی رات کو ایک ٹکیا جوار کی کھاتا ہوں۔ تم لوگوں کا اصرار تھا اس لئے آ گیا"۔

باجرہ[1] کی ماں ۔ "ہمارا تو منہ نہیں کہ حضور کا شکریہ ادا کریں۔ آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ ہم تو ناامید ہو چکے تھے۔ اب دیا ہے تو عمر کا دیجئے گا۔ چراغ کا جو حضور نے حکم دیا تھا جلا دیا ہے"۔

پیر جی ۔ "سب دیکھ لی جائے گی۔ تم لوگ پہلے تو احتیاط کرتے نہیں پیچھے ہم کو ستاتے ہو۔ ہم کو باجرہ کے علاج میں بہت دقت ہوئی۔ بڑی مشکل سے ظالم قبضہ میں آیا ہے"۔

باجرہ کی ماں ۔ "خدا حضور کی عمر دراز کرے۔ ہماری تو اگر کھال کی جوتیاں بھی حضور پہنیں تو عذر نہیں۔ یہ کپڑے حضور کے لائق تو نہیں ہیں مگر ہمارا دل بڑھ جائے گا"۔

پیر جی ۔ "اچھا اگر تمھاری یہ ہی خوشی ہے تو خیر کسی نہ کسی کے کام آ ہی جائیں گے"۔

باجرہ کی ماں ۔ "حضور آج ایک اور واردات ہو گئی۔ ابھی ابھی حضور کے آنے سے ذرا پہلے کسی کم بخت نے بچی کے کپڑے اُتار لئے۔ کس نے کیا؟ ہم کو خود اچھی طرح معلوم ہے۔ اب حضور وہ نکلوا دیں"۔

پیر جی (کچھ تامل کے بعد) "ابھی تو کپڑے اس کے پاس موجود ہیں۔ اس سے کہہ دو کہ اگر ہنسی خوشی نہ دے گی تو تہس نہس کر دوں گا۔

---

[1] انعام کی بیوی کا نام ہے۔

کیوں تم ایسے چوروں کو گھر میں گھسنے دیتے ہو۔"

ہاجرہ کی ماں "حضور سگے چچا کی بیٹی ہے اس لئے بلا لیا تھا۔ صادقہ اری صادقہ! یہاں تو آ۔ حضور فرما رہے ہیں کہ اگر سیدھی طرح کڑے نہ دیئے تو غارت کر دوں گا۔"

پیر جی ۔ "ایک کوری بدھنی پانی بھر کر لاؤ۔ کاغذ، قلم، دوات دو اور سب مہمانوں کے نام لکھوا دو ۔ میں ابھی چور کا نام نکال دیتا ہوں۔"

پانی بھری ہوئی بدھنی ایک طرف سے پیر جی نے دوسری طرف سے انعام نے انگلی پر رکھی اور پیر جی کچھ پڑھتے گئے۔ ٹونٹی میں ایک ایک کر کے ناموں کے پرزے ڈالتے جاتے تھے۔ ایک نام پر بدھنی نے گردش کی۔ پرزہ نکال کر دیکھا تو صادقہ کا نام تھا۔ پیر جی کی فال اور کچھ چوری چھپے نہیں، سب کے روبرو اور ہر ایک کے سامنے۔ اب صادقہ کو چور سمجھنے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یقین کامل ہو گیا۔ اپنے اپنے طور پر سمجھا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، غصہ سے، پیار سے، جس سے جس طرح ہو سکا کڑوں کے نکلوانے کی کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خود انعام نے کہا:۔

"صادقہ! دو چار روپیہ کا مال ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ چار ساڑھے چار سو کے کڑے ہضم کر لینے آسان بات نہیں ہے۔ میں خدا سے ڈر کر اور تم پر رحم کھا کر لایا تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ تم اللہ کی عنایت سے سب گنوں پوری ہو اور ایسا کلیجے میں ہاتھ ڈالو گی کہ سب تڑپتے ہی رہ جائیں گے۔ اتنا کچھ کہا جا رہا ہے اور تم پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کچی نہیں دھاڑی چور ہو۔ پہلا موقعہ نہیں کہ ڈرانے میں

آجاؤ گی مگر یاد رکھو میں بھی داروغہ ہوں۔ دم بھر میں اگلوا لوں گا۔ ابھی تو منہ ہی سے کہہ رہا ہوں پھر تم جانتی ہو، میرا غصہ کیسا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کسی بہانے سے ادھر ادھر ڈال دو۔ آیندہ تم کو اختیار ہے"۔

صادقہ کو اس وقت دین و دنیا کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ آنکھیں نیچی تھیں جن سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی گود میں بچہ تھا جو بے خبر پڑا سوتا تھا۔ وہ ساکت تھی، خاموش تھی اور بس نہیں چلتا تھا کہ زمین میں گڑ جائے۔ سینکڑوں بیویوں کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔ اس کی حالت ظاہری، اس کے میلے کچیلے کپڑے، اس کا افلاس و مصیبت چوری کا پورا یقین دلا رہے تھے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر جوش اٹھتا تھا اور وہ سوچتی تھی اب اس سے زیادہ نازک وقت اور مصیبت کا دن کیا ہوگا۔ شوہر گیا، دولت گئی، چین گیا، آرام گیا، پینے کو چھپڑا نہ رہا، رہنے کو ٹھکانہ نہ رہی، ماں باپ ساس سسرے سب رخصت ہوئے، ایک تھوڑی سی آبرو باقی تھی آج وہ بھی چلی۔ جو لوگ عیش کرتے دیکھتے تھے، جن آنکھوں نے گھر والی اور با اختیار دیکھا تھا، اب ان کے سامنے چور بنی کھڑی ہوں۔ اللہ اللہ کیسا درد انگیز سماں ہے! دفعتہً اس نے آنکھ اوپر اٹھائی انعام کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کچھ شک نہیں خدا نے آپ سب کو جو عزت دی ہے بیں اس وقت اس سے محروم ہوں۔ میری بابت جو کچھ کہا جائے ٹھیک ہے۔ میں مفلس ہوں۔ مجھ پر ہر الزام لگ سکتا ہے۔ بے وارث ہوں جس کا جو جی چاہے کہہ لے۔ آپ کے گھر پر ہوں جو کچھ سنوں درست۔ اب آپ کے قبضہ میں ہوں جو کہا جائے ٹھیک۔ مگر وہ بدنصیب جس نے

خدا ہے کیا کسی بندے سے بھی کبھی جھوٹ نہ بولا تم کو یقین دلاتی ہے کہ چھ پہر کی بھوکی صرف اس کونے میں بیٹھی رہی۔ میں نے تمہاری خوشیاں، تمہاری رسمیں، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں۔ تم نے مجھ کو گھر پر بلا کر میری آبرو لی۔ میں بے گناہ ہوں۔ گو اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے برابر بیٹھ سکوں مگر چور نہیں ہوں۔ میں نے تمام عمر کبھی قسم نہیں کھائی لیکن اس وقت کہتی ہوں کہ میری بے گناہی کا شاہد صرف وہ ہے، جس کی نگاہ میں میرا افلاس اور تمہارا تمول دونوں برابر ہیں۔ سب کچھ کھو چکی، میرے سر سے وارث اٹھ گیا، میری جائداد برباد ہوئی، میری کمائی لٹ گئی، لیکن عمر بھر کی پونجی، زندگی کا سرمایہ دنیا کی کل کائنات، صرف یہ ایک معصوم لال میری گود میں ہے۔ تم صاحب اولاد ہو میری ممتا کی قدر کرو۔ میں اس بچہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں، میں نے تمہارے کڑے نہیں لیے۔ میں جب سے آئی ہوں تمہارے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میں تنہا ہوں۔ میرا بچہ بغیر میری مدد کے چل بھی نہیں سکتا۔ تم میری تلاشی لے لو اور اس جرم کی سزا دو کہ جب میں اس لائق نہ رہی تھی تو کیوں تم لوگوں کی خوشی میں شریک ہونے کی خواہش مند ہوئی۔ مجھ کو گھر سے نکال دو۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ہاں یہ تھوڑی سی عزت باقی رہ گئی تھی وہ یوں ختم ہو گئی۔ باپ دادا کی وقعت، بزرگوں کی آن، شوہر کی لاج، سسرال کی عزت اس وقت مجھ بدنصیب نے گنوادی۔ میری مصیبت ہم دردی کی محتاج ہے۔ اپنے بچوں کا صدقہ مجھ کو اب زیادہ رسوا نہ کرو۔ اگر تمہارا ظلم صرف میری ذات تک رہتا تو شکایت نہ تھی۔ تم نے اس بے زبان پر، اس ننھی سی جان پر، اس معصوم روح پر ستم توڑا۔

اگر یہ زندہ رہا تو اس کی عمر برباد ہوئی۔ عزیز اس سے نفرت کریں گے، دوست اس پر لعنت بھیجیں گے اور ماں کی چوری اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہو گی۔ تم با اختیار ہو، قدرت رکھتے ہو، عزت رکھتے ہو خدا نے تم کو دولت دی، حکومت دی، اطمینان دیا، راحت دی۔ جس نے تم کو خوشی کا دن دکھایا اسی کا واسطہ دیتی ہوں، میرے درپے نہ ہو۔ میں دنیا کی بدترین مخلوق اور انقلاب کی بہترین تصویر ہوں۔ میرا دل زخمی ہے، میرے زخم ہرے ہیں، میرا کلیجا چھلنی ہے، میرے داغ تازے ہیں۔ میں بے بس ہوں، بے کس ہوں، دکھیاری، مصیبت کی ماری۔ میری حالت قابل رحم ہے، مجھ پر رحم کرو۔ مالک ہو، مختار ہو، کہہ سکتے ہو، تمہاری عنایت و کرم کی محتاج ہوں۔ بے قصور ہوں۔ میں نے تمہارے کڑے نہیں دیکھے۔ انعام بھائی میرے وارث شرعی ہو۔ خدارا مجھ کو بچاؤ۔ اس مصیبت سے نجات دلواؤ، میری مشکل آسان کرو۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔ میں عہد کرتی ہوں کہ آج کے بعد اب کہیں آنے جانے کا نام نہ لوں گی۔ مجھ کو ڈولی لا دو۔ میں چلی جاؤں۔"

پیرجی ۔ "کیا چاتر عورت ہے۔ قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ خدا کا کلام جھوٹا، ہم جھوٹے۔ کم بخت، چور، مکّار!"

جس جس کے منہ میں جو جو کچھ آیا کہتے ہیں اور سنانے میں کمی نہ کی۔ بدنصیب حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ایمان کی بھی بولے۔ مگر چاروں طرف سے لعنت دھتکار پڑ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب نذر و نیاز ہو چکی تو پیرجی اپنا جوڑا، نقد روپیہ اور کھانا لے کر چلتے ہوئے مگر چلتے چلتے اتنا اور کہہ گئے۔ "خدا کی شان ہے۔

دیوں کے ہاں بھوت مولویوں کے ہاں ایسی سپوت لڑکی پیدا ہو جو اچھے اچھے دہاڑیوں کے کان کترے! صبح تک راہ دیکھ لو۔ دے دے تو خیر۔ نہیں تو تھانہ دار کے سپرد کر دینا۔"

تھانہ دار کا نام سنتے ہی صادقہ تھرّا اٹھی۔ جانتی تھی کہ پیر جی کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ صبح ہوتے ہی تھانہ دار آجائے گا۔ اس بکرے کی طرح جو قصائی کی آب دار چھری سے ڈر کر چاروں طرف چھپنے کی کوشش کرے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہر طرف نگاہ دوڑاتی تھی مگر کوئی ایسا نہ نظر آتا تھا کہ آڑے وقت میں کام آجائے۔ پیٹ میں ہول اٹھ رہے تھے۔ اٹھتی تھی، ٹہلتی تھی، بیٹھتی تھی، سوچتی تھی، بیٹھتی تھی۔ خیال آیا کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب، مجھ سے بڑھ کر بے عزت کون ہوگا۔ دنیا کو موت آرہی ہے۔ کیسے کیسے پیارے آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئے اور میں کم بخت اس دن کو زندہ رہ گئی کہ باپ دادا کی ناک کاٹ دوں۔ تیری شان تجھی کو سزاوار ہے۔ جس کی پالکی پر دوہرے پردے پڑے دیکھے، اسے تھانہ دار کے سامنے برقع بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آسمان کے موتی جگمگا رہے تھے۔ سجدہ میں گری اور گڑگڑا کر کہا "آقا! بدنصیب لونڈی تیری حضور میں حاضر ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی۔ دنیا بے خبر ہے مگر تو باخبر۔ سب سوتے ہیں اور تو جاگتا ہے۔ صبح قریب ہے اور آرہا ہے وہ وقت جب ایک غیر مرد کا آمنا سامنا اور نامحرم نگاہیں میرے چہرے پر ہوں گی۔ جس کا پلّہ بھی محلہ والوں نے نہ دیکھا، جس کی پرچھائیں تک نوکروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی آج دنیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہے۔

اس وقت ظالموں سے بچانے والا کوئی نہیں۔ مولا تیرے سامنے آئی ہوں۔ میری فریاد سن! دلوں کے حال دیکھنے والے! آنے والا وقت مجھ کو نہ دکھا بچا، بچا، مولا بچا!"

ماں باپوں کی بیٹیاں اور عفت وعصمت کی وہ دیویاں جن کے دامنوں پر فرشتے نماز پڑھیں زندگی کی کسوٹی پر سونے کی طرح چمکیں اور کندن کی طرح دمکیں۔ صادقہ بہ ظاہر بے وارثی، محتاج، فقیر، سب ہی کچھ تھی مگر اس کے میلے کپڑوں پر مصالحہ دار پوشاکیں قربان، اس کے افلاس پر تموّل نثار اور اس کے ننگے بدن پر جڑاؤ جھالے بالے فدا تھے۔ اس کی التجا دکھتے ہوئے دل سے نکلی اور عرش بریں پر پہنچی۔ کہتے ہیں زخمی دل کی صدا خالی نہیں جاتی۔ یہ تھا یا جو کچھ تھا، بھائی کی جانب سے ناامید ہو کر جب حقیقی وارث سے التجا کی تو اس کی دعا قبول ہوئی۔ سجدہ میں تھی کہ جی متلایا، قے ہوئی، دست آیا اور ایک نہیں ہی گھنٹہ میں دو دن کی بھوکی مہمان کی حالت بھائی کے در پر خراب ہونی شروع ہو گئی۔ تین بجے کے قریب جب زیادہ طبیعت بگڑی اور ہلنے کی طاقت نہ رہی تو بچہ کی مفارقت کا خیال آیا۔ دل نے بے ساختہ صدا دی کہ کلیجے کا ٹکڑا ماں کے پکھوے سے ہمیشہ کو چھوٹتا ہے۔ پرورش تو درکنار کوئی اتنا بھی نہیں کہ سر پر ہاتھ پھیر دے گا۔ کچھ عمر بھی تو نہیں۔ نگوڑا تیسرے ہی سال میں ہے۔ بات بھی تو کرنی نہیں آتی۔ آج اس کی ضدیں اور ہٹیں سب ختم ہوتی ہیں۔ ابھی میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ ایک دفعہ کلیجے سے لگا لوں۔ آ میری جان آ۔ پیار کی نگاہیں اور محبت بھری نظریں آج ہمیشہ کو بند ہوتی ہیں۔ چھاتی سے لگانے والی ماں اور اس

چاند سے ٹکڑے پر قربان ہونے والی خدمت گذار رخصت ہوتی ہے۔ لپٹ لوں، لپٹا لوں۔ کوئی اتنا نہیں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دوں۔ خیر سب سے بہتر وارث خدا ہے، پیاس کی شدت زیادہ ہوئی، اٹھنے کا ارادہ کیا۔ جوں توں اٹھی بھی، مگر دو ہی قدم چلی تھی کہ چکر آیا اور دھڑ سے گری۔

بیس بائیس برس کی زندگی کا نتیجہ صرف ایک بچہ تھا جو اس وقت ماں کے پاس تھا، اسی کا سہارا لے کر اٹھی اور پھر لیٹی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگائے، پیار کیا، گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے بھینچا۔ کہنے لگی" الٰہی زندہ رکھنا ہے تو عزت سے ۔ ورنہ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر۔"

موذن اذان دے رہا تھا کہ دروازہ پر چند آدمیوں کی آواز آئی اور ایک شخص نے بہ آواز بلند کہا" مولانا! باہر آیئے۔ تھانہ دار صاحب آئے ہیں۔ یہ آپ کی ماما کپڑے بیچتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔" تھانہ دار کا نام سنتے ہی صادقہ کی حالت اور بھی ردی ہو گئی۔ بھائی کو پاس بلا کر ہاتھ جوڑے اور کہا۔

" خدا کا واسطہ مجھ پر رحم کرو میں نے تمہارے کپڑے نہیں لیے۔"

سوئزرلینڈ کی سیر

(سر عبدالقادر)

کیسا ہی دل چسپ مقام کیوں نہ ہو آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے۔ لندن اس وقت مرجع انام ہے۔ لیکن چہارشنبہ ۱۸ر جولائی ۱۹۰۶ء کے دن کوئی ہمارے جی سے پوچھتا کہ لندن سے جانے کی کس زور سے آرزو تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ دو بجنے کو تھے کہ ہم[1] ریل پر پہنچے۔ چند دوست ہمیں وداع کرنے آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم قابل رشک ہیں کہ سوئزرلینڈ کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم بے تاب تھے کہ گاڑی چلے۔ دو بج کر بیس منٹ گذرے اور گاڑی چلی۔ لندن سے فوکسٹن تک دو گھنٹے کا رستہ تھا۔ بارہا دیکھا ہوا تھا۔ اس کے ہرے ہرے مرغ زاروں سے انگلستان میں رہتے رہتے نگاہ کافی آشنا ہو چکی تھی۔ مگر اس دن میں خدا جانے کیا جادو کی تاثیر تھی کہ وہ رستہ بھی غیر معمولی طور پر دل چسپ معلوم ہوتا تھا اور وہ اونچے نیچے

---

[1] اس سفر میں میرے دوست شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی میرے ہم راہ تھے اور اسی لئے جا بجا لفظ "ہم" استعمال ہوگا۔

کھیت جن میں بھیڑوں کے گلے چرتے پھرتے تھے نہایت دل فریب نظر آتے تھے۔ وہ تو کیا بدل گئے ہوں گے، ہماری نگاہ بدلی ہوئی تھی یا آنے والے مناظر انگلستان کی ناہموار مگر سرسبز زمین پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔

فوکسٹن پہنچ کر ہم جہاز میں بیٹھے۔ حسن اتفاق سے دریا میں تموج کم تھا۔ ہنستے کھیلتے کھاتے پیتے گھنٹے بھر میں ہم نے بولون ساحل فرانس کو جالیا۔ مسٹر کی جگہ موسیو! موسیو! کا شور ہے۔ فرانسیسی حمّال اسباب اٹھانے کو دوڑے آتے ہیں۔ بات بات میں سر سے پاؤں تک حرکت کرتے ہیں۔ کچھ پوچھو تو دونوں شانے ہلا کر اس طرح "ژِدو نہ سے پا"[1] کہتے ہیں کہ نیچے کا ہونٹ علامت انکار کے طور پر خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے بھویں اوپر کو کھنچ جاتی ہیں۔ اور پیشانی پر دو تین شکن پڑ جاتے ہیں۔ ہم ان کی بات سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ اپنے مطلب کی خوب سمجھتے ہیں۔ اسباب اٹھا کر یہ جا وہ جا۔ بہت عنایت کی تو اشارے سے بلاتے جاتے ہیں کہ ادھر آؤ ادھر آؤ۔ کوئی جانے ریل پر سوار کرانے جا رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ دوآن[2] کا قضیہ پہلے درپیش ہے فرانس میں تمباکو پر بہت محصول ہے اور زیادہ تر اسی کی پرسش ہوتی ہے کہ کہیں اسباب میں تمباکو تو نہیں۔ بعض دفعہ اسباب کھول کر دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ صرف پوچھتے ہیں۔ کوئی چیز چنگی کے قابل تو نہیں؟ اور اعتبار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ریل تیار ملتی ہے اور حمّال اسباب لاکر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں۔

ہم جہاز سے اترنے کو تھے کہ ایک انگریز ہم سے مخاطب ہوا۔ اور

---

[1] میں نہیں جانتے (فرانسیسی) [2] چنگی خانہ (فرانسیسی)۔

پوچھنے لگا "کیا آپ مالٹا کے رہنے والے ہیں۔" ہم نے کہا "نہیں ہم ہندوستانی ہیں" وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ "عجیب بات ہے۔ اسی جہاز میں دو اور شخص ہیں، بالکل آپ کے ہم رنگ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں ہم مالٹا کے باشندے ہیں۔ اب میں نے سمجھا کہ آپ بھی ان کے ساتھ ہوں گے اور آپ سے پوچھا تو آپ ہندوستانی نکلے۔ میں نے آج دو دفعہ غلطی کھائی۔ مگر میرا کیا قصور ہے۔ آپ کے رنگ اس قدر ملتے ہیں۔" ہم پوچھنے ہی کو تھے کہ وہ مالٹا کے آدمی کہاں ہیں کہ وہ سامنے آگئے۔ اس انگریز سے اور ان سے باتیں ہو چکی تھیں۔ اس نے ہمیں ان سے ملا دیا۔ جب ہم سب دوآں سے فارغ ہو کر ریل میں سوار ہوئے تو اتفاق سے ہم اور ہمارے ہم رنگ مالٹی ایک ہی کمرے میں تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا "آپ کہاں جاتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔ لوسرن! پھر کیا تھا۔ ہم اچھل پڑے کہ راستے بھر کے لئے رہ بر خدا نے بھیج دیے۔ منشیر نے بر محل یہ شعر پڑھا ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہم چلتے وقت اس خیال سے کسی قدر متردد تھے کہ سوئزرلینڈ میں زبان نہ جاننے سے ہمیں دقت ہوگی۔ لیکن ان مالٹی حضرات کے مل جانے سے وہ تردد رفع ہوگیا۔ یہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے اور لوسرن کی سیر پہلے بھی کر چکے تھے۔

ہمارے دو ہم سفروں میں ایک نوجوان تھا ایک بوڑھا۔ نوجوان چرٹ اور سگرٹ کی تجارت کرتا تھا اور بوڑھا مالٹا کے ایک مدرسے کا

معلّم تھا۔ دونوں متوسط حالت کے آدمی تھے مگر محض شوقِ سیر سے نکلے تھے۔ شمالی افریقہ کی سیر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے وہاں سے انگلستان آئے۔ چند روز لندن میں رہ کر اب سوئزرلینڈ اور اٹلی کے راستے گھر جا رہے تھے۔ ہم نے ان کی ہمت کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا یورپ میں سیر و سیاحت معمولی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ہم لوگ سال بھر محنت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ مہینہ دو مہینے ہر برس آرام اور تفریح کے لئے بھی چاہیے۔ اس سے آدمی تن درست رہتا ہے اور باقی مہینوں میں کام اچھی طرح کر سکتا ہے۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیل آب و ہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً سیر سے انسان کے خیالات کی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور گھر گھسنے پن کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے رفع ہو جاتی ہے۔ ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے اور ہم اپنی زبان میں۔ ایک دفعہ میں نے جو ذرا کان لگایا تو ان کی گفتگو میں کئی الفاظ عربی معلوم ہوئے۔ میں نے پوچھا "آپ عربی بول رہے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا۔ نہیں۔ یہ مالٹی ہے، عربی اور اطالین کی ترکیب سے بنی ہے اور اس میں بکثرت عربی الفاظ اب تک موجود ہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں کا جزیرۂ مالٹا میں عمل دخل رہا ہے اور مالٹی زبان کی ترکیب اس زمانے کا ایک پائدار نقش ہے۔

بولون سے جب گاڑی چلی ہے تو چھ بجے تھے۔ آمین پہنچے تو رات ہولی تھی۔ اسٹیشن کے قریب آتے ہی دریچے سے سر نکال کر ہم نے بہت چاہا کہ شہر کے نقشے کا کچھ اندازہ ہو سکے مگر سوائے اس کے کہ چراغوں کی

روشنی یہ بتائے کہ خاصا بڑا شہر ہے کچھ زیادہ پتہ نہ چلا۔ ہاں تھوڑی دیر سٹیشن کی سیر کی اور پھر گاڑی میں آ بیٹھے ہم راہیوں نے سونے کی تیاری شروع کی، مگر مجھے نیند کیوں کر آتی سوئٹزر لینڈ کو دیکھنے اور ایشیا کے سوئٹزرلینڈ (کشمیر) سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میں ہمہ تن انتظار تھا اور گنتا تھا کہ کب صبح ہوگی۔ مشکل یہ کہ رات کو باغ و راغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ "سٹیشن شماری" جاری رہی۔ اگلے وقتوں کے لوگ انتظار میں اختر شماری کیا کرتے تھے، اب وہ ترکیب پرانی ہوگئی۔ ریل کے سفر میں رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ سچ ہے ہر زمانے کی ضرورتیں جدا ہیں اور ایجاد ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے یا جیسا انگریزی والے کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ چنانچہ ریل کے سفر میں بے تاب طبیعتوں کے واسطے انتظار کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے لیے "سٹیشن شماری" ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ نہ کیا ہو تو میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ نسخہ آزمانے کے قابل ہے۔ اختر شماری سے کم دل چسپ نہیں اور طبیعت اس سے تھکتی کم ہے۔ نئی سواریوں کی بے قراری کہ گاڑی میں جگہ ملے، اترنے والوں کی بے تابی کہ جلد اتریں۔ ریل کے اہل کاروں کا ادھر ادھر ٹہلنا جیسے اس چھوٹے سے قطعۂ زمین کے خود مختار بادشاہ ہیں۔ سٹیشن پر روشنی کا زور سٹیشن کے باہر دور اندھیرے میں سرخ و سبز لالٹینوں کی رنگا رنگی، اگر کوئی کہے کہ یہ تماشا دل چسپ نہیں تو اس کا نام صاحبان مذاق سلیم کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیے۔ میں ہر سٹیشن کو اٹھ کر دیکھتا تھا اور اس کا نام پڑھ کر پنسل سے اپنی یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتا تھا۔

پہلے دو سٹیشن ذرا جلد جلد آئے پھر دیر دیر سے آنے لگے۔ لاوان۔ ریم۔ شانون۔ شومان۔ درسو۔ بلفور تک کی تو رسید دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد چشم انتظار کو بھی خواب نے آلیا۔ رات آخر رات ہے قدرت کا زبردست نظام اپنے احکام کی تعمیل کرائے بغیر کسے چھوڑتا ہے۔ صبح کے قریب ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگ گئی اور انتظار کا خاتمہ ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو مول ہاورزن سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ یہاں سے گویا سوئٹزرلینڈ کا علاقہ اور جرمن زبان کا دور شروع ہوا۔ اشتہارات جرمن ہیں۔ مکانوں کے نام جرمن میں۔ کرخت جرمن بولنے والے لوگ آکر شریک راہ ہونے لگے۔

مگر یہاں ان کی کسے فکر تھی۔ صبح صادق کا سہانا سماں، سوئٹزرلینڈ کا خوب صورت ملک، ریل کے دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ اور سبزہ پر شبنم کے موتی بہار دے رہے تھے۔ میں کوٹ پہن کر بیٹھ گیا اور علاقہ کی سیر کرنے لگا۔ اتنے میں سورج نے سر نکالا۔ درختوں کے پتوں کا ماہ جولائی کا گاڑھا سبز رنگ آغاز بہار کے ہلکے دھانی رنگ کی جھلک دکھانے لگا۔ مقام بال پر گاڑی رکی تو وہاں کی آبادی کو دیکھ کر جی خوش ہوگیا اور سب سے زیادہ خوشی یہ تھی کہ گھڑی دو گھڑی میں لوسرن پہنچیں گے۔ صبح کے سات بجے گاڑی ایک عالی شان سٹیشن پر تھی۔ ایک پر فضا جھیل اس کے کنارے درختوں کی قطار اور درختوں کے پیچھے بلند اور شان دار عمارتیں۔ یہی لوسرن تھا۔ دیکھتے ہی رات کی کلفت بھول گئی۔

لوسرن۔ سٹیشن نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہے۔ نکلتے ہی سامنے جھیل کا وسیع تختۂ آب ہے۔ دائیں ہاتھ عجائب خانہ کی عمارت اور

بائیں ہاتھ کو بڑے بڑے ہوٹل ۔ یہاں کسی نے نہیں پوچھا کہ اسباب میں کیا ہے۔ یہاں کے لوگ مسافروں کو ہر طرح خوش کرنا چاہتے ہیں ۔ کیوں کہ ان کی روزی مسافروں کی کثرت آمد و رفت سے ہے ۔ ہم اپنے مالٹی دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے جہاں وہ پہلے ٹھہر چکے تھے ۔ انھوں نے ہمیں کہا کہ ذرا سستالیں دوپہر کو جہاز پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کو چلیں گے ۔ ہم نے کہا بہت خوب ۔ لیکن سستانے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا ۔ ہمیں دوسری صبح کے لئے کسی نئے نظارے کی فکر تھی اور لوسرن میں جو کچھ دیکھنا تھا ، اس کے لئے یہی دن تھا ۔ بس ہوٹل میں اسباب رکھتے ہی منہ ہاتھ دھو کر ہم باہر نکلے کہ بارہ بجے تک نزدیک کی چیزیں دیکھ آئیں ۔

سوٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حسن قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر لوسرن اور اس کے قرب و جوار کو یہاں کی سینری کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں ۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے ، تو مناظر قدرت کا مرکز لوسرن ہے ۔ کوہ الپس برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع مشکل ہے ۔ کوہستان کے ہر قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں ۔ مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں اور محبوبۂ بہار کو بہ صد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں ۔ موسم گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہوگی ۔ جنھیں دولت اور فراغت دونوں میسر ہیں وہ تو یہاں آکر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے ۔ اس کو مرکز قرار دے کر گرد و نواح کی سیر کر آتے ہیں اور پھر یہیں آجاتے ہیں ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے

درمیان یعنی اپریل کے شروع سے ستمبر کے اخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہ رو فرض کئے جائیں جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پُر فضا مقام کی سیر کرتے ہیں تو آدھے ایسے جو یہاں معقول عرصہ کے لئے قیام کرتے ہیں۔ ان ہی آنے جانے والوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں اور ان ہی کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے۔ اس کی سڑک کو دور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلہ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لے جانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو لڑھک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دخانی جہاز چلتے ہیں جو مختلف قابل سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں اور ہر جگہ لوگ اتر کر آگے تھوڑی دور پیدل سیر و تماشے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں۔ جس مذاق کا کوئی آدمی ہو اپنی پسند کی سواری ڈھونڈھ لے اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے۔ شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے اور مکانوں کے لمپ اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی ہیں۔ لیکن

اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو تو وہ آبادی سے کچھ دور نکل جائے۔ چاروں طرف مناظر قدرت اس کے مونس و ہمدم ہوں گے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہوگی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات، نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا، نہ اس تخلیے میں خلل ڈالنے والا۔ اگر کہیں اسی شوق کا مارا اسی کا ہم خیال کوئی اور بھی آنکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پا کر خود ہی اور گوشہ ڈھونڈھ لے گا۔

ہماری سیر ان دونوں قسموں سے علاحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسّر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے، جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے، ایک پھول سے دوسرے پر۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام، ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت و صنعت کے جلوے۔

۱۹ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء **عجائب خانہ صلح و جنگ**۔ لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ بیس مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلات حرب اور طریق جنگ میں قدیم زمانوں سے لے کر آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کی منشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پرانی سے پرانی توپوں سے لے کر زمانۂ حال کی کرپ توپیں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ کون سی کس زمانے

کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں اور دوسری طرف طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحۂ روما کے لیے ہے اور ایک ازمنۂ متوسطۂ یورپ کے لئے۔ جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحہ استعمال ہوئے تھے، ان کا علٰحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جدا ہے اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جدا۔ یہ نظارے تاریک کرے میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہوبہو دکھائی دیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگ روس وجاپان بھی موجود ہے۔ قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج، بیماروں اور زخمیوں کے اٹھانے اور لے جانے کی تدابیر، جنگ میں عارضی پل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری لڑائی کی خصوصیات۔ سب کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے سب بڑے بڑے مدبروں کی تصویریں رکھی ہیں۔ جو صلح عام کے حامی ہیں اور جو مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبر کی تصویر دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا ارفع الدولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صلح۔ اہل یورپ نے آج کل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکا لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبروں کی صف اول میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔

اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مختلف زبانوں میں صلح سے متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے

تھے اور ہر شخص مجاز تھا کہ ان میں سے چند چن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور ان کے خلاف اہل یورپ کو اکسانے کے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی انھیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صلح ایسی ہی تدابیر صلح پھیلانے کی کر رہی ہے اور ان کے قول وفعل میں ایسی ہی مطابقت چاہئے؟ حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسی قدر ہے کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب مل کر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں۔ لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جب تک دول یورپ اور اُن کے مدبروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام ومذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیوں کہ یہی دو خیال سب فساد کی بنا اور جنگ وجدال کی جڑ ہیں۔

اس صلح و جنگ کے عجائب خانے میں آلات حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت ہے، غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق جنگ و شوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ سے زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم وفنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آرہی ہے کہ وقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے ہیں اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھار ہو سکتی ہے۔

برفانی باغ ۔ اس عجائب خانہ صنعت سے نکل کر ہم ایک عجائب خانہ قدرت کی طرف گئے۔ جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں۔ برف کے یہ تودے اس زمانہ کی یادگار ہیں جب سارا

سوئٹزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گذرا ہے۔ ماہران علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک وقت میں روئے زمین کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی تو وہاں بھی حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے۔ مگر اب ان حیوانات کی نسل بھی منقطع ہے۔ کہیں کہیں ان کے پنجے اور ہڈیاں دست یاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساخت کیا تھی اور موجودہ جان داروں سے کس قدر نرالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا۔ مگر اس وقت اس زمانہ سے بحث نہیں بلکہ صرف عہد برف سے کام ہے جس کی یہ حیرت انگیز نشانی لوسرن میں موجود ہے۔ برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے اندر رواں ہوا اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے جو پگھلنے سے بچ رہے بہتے ہوئے آئے اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک چکر میں آ پھنسے۔ یعنی ایسی جگہ پہنچے جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے۔ اب نہ "روئے ماندن نہ راہ رفتن" جائیں تو کہاں جائیں۔ پانی ہے کہ اوپر سے برابر آرہا ہے اور انھیں حرکت دیئے جاتا ہے۔ مگر یہ قلعہ بند ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آرام سے بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں آن پھنسے کہ رات دن ایک مقام پر چکی کی طرح گھوم رہے ہیں۔ خود بھی گھستے ہیں پتھروں کو بھی گھساتے ہیں۔

یہ خدمت صدیوں سے ان کے سپرد ہے، نہ کبھی رخصت نہ تعطیل۔ اتنی خیریت تھی کہ چشم مردم سے ان کی یہ سزا پوشیدہ تھی۔ مگر آج کل انسان

کو یہ جرأت ہوئی ہے کہ ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردۂ راز اُٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بے چارے معتوب تودہ ہائے برف کی پردہ دری کیے بغیر بھی نہ رہا۔ ۱۸۷۲ء تک یہ قطعہ زمین جہاں اب یہ عجیب برفانی باغ ہے ایک چراگاہ تھا اور اس کی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ برفانی کارخانہ جاری تھا۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک جگہ زمین میں سوراخ ہوگیا اور وہاں سے اس برفانی چکی کی آواز آئی۔ کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا۔ اور پھر ایک چکی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل آئیں اور اس حصہ کو تماشائیوں کو محوِ حیرت کرنے کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ اس کھدائی میں اس عہد کے جانور اور درخت ملے جو پتھر کی طرح سخت بن چکے تھے۔ اب لوگ جوق جوق ان عجائبات کو دیکھنے آتے ہیں۔ تواریخ و جغرافیہ دونوں علوم کے شائقوں کی دل چسپی کا سامان یہاں موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدیم باشندوں کی جھونپڑیوں ان کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے نمونے بھی اسی احاطے میں ایک جگہ دکھائے گئے ہیں۔ اور عام تماشائیوں کی دل چسپی کے لئے ایک نہایت خوش وضع بھول بھلیّاں بنائی گئی ہے جو عربوں کے مشہور قصر الحمرا کی بھول بھلیاں کی نقل ہے۔ بھول بھلیاں سے نکلتے ہی باغ کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جہاں چٹان کاٹ کر ایک بڑا شیر بنایا گیا ہے جس پر شہر لوسرن کو ناز ہے اور جو فی الواقع سنگ تراشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

باغ سے لوٹتے ہوئے ہوف کرک جو کیتھولک مذہب کا بڑا گرجا ہے رستے میں پڑتا تھا۔ ہم نے اسے بھی ایک نظر دیکھا۔ بلندی پر واقع ہے اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازے تک پہنچتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی گرجاؤں میں ایک مخروطی مینار ہوتا ہے۔ اس گرجا کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس کے دو مخروطی مینار بنائے گئے ہیں جنھیں جڑواں مینار کہتے ہیں۔ گرجا کے اندر لکڑی کا کام بہت خوب صورت بنا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی ساخت کا نمونہ ہے۔ اس زمانہ میں اہل سوئٹزرلینڈ کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا گو اب بھی وہ اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس گرجا کی شہرت صرف اس کی بڑائی اور وسعت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے ارغنوں کی وجہ سے ہے۔ یورپ کے گرجاؤں کے ارغنوں بجائے خود عجائبات ہیں۔ دھات کی لمبی لمبی بانسری نما نلیاں متوازی رکھ کر ایسی بلند اور سریلی آواز پیدا کی جاتی ہے کہ گرجا گونج اٹھتا ہے۔ فن موسیقی کے ماہر ایک ایک ارغنوں کی ساخت میں اپنا کمال صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ارغنوں جو ہوف کرف کی زینت ہے گاسلر نامی ایک استاد نے ۱۶۵۰ء میں بنایا تھا۔ اس کے بعد ہاس نامی ایک اور استاد نے ۱۸۶۳ء میں اس کی تجدید کی۔ ۱۸۹۸ء میں پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نو سو پچاس بنسریاں اس ارغنوں میں ہیں۔ لوگ دور دور سے اس کا راگ سننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنوں بجتا ہے اور اس وقت کا داخلہ ایک فرانک (دس آنے) ہوتا ہے۔

جھیل کی سیر۔ جھیل لوسرن جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے اس ملک کی نہایت خوب صورت جھیلوں میں سے ہے اور بعض اعتبارات سے سب سے بڑھ کر گنی جاتی ہے۔ اس کا طول ۲۲ میل ہے اور عرض آدھے میل سے لے کر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجیب بہار دیتی ہے۔ جس سیاح کو فرصت ہو وہ یہاں مہینوں رہے اور روز کشتی میں بیٹھ کر سیر کو جائے۔

جہاں کہیں خشکی پر اُتر کر کوہستان کی سیر کرے گا، اس کے لئے کوئی نہ کوئی قابل دید منظر موجود ہوگا۔ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی اس لئے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکلے۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوش گوار تھی۔ گرد و پیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ وہ سٹیشن آگیا جہاں سے ہلکی پہاڑی ریل پر بیٹھ کر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اتر پڑے اور ریل پر سوار ہو لئے۔

رگی کلم کا منظر۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ایسی ایسی ڈھلواں چوٹیوں پر چڑھتی ہے کہ اب گری اب گری۔ مگر فن انجینیری کی خوبی دیکھئے، گاڑیوں اور آہنی سڑک دونوں کی ساخت میں وہاں یہ خصوصیت پیدا کی ہے کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں اور مزید احتیاط کے لئے اوپر جاتے وقت انجن نیچے سے اوپر کو ڈھکیلے لئے جاتا ہے۔ اور رگی پر جا کر ٹھیرتا ہے جو اس سطح سے جہاں سے ریل لی تھی چار ہزار تین سو ساٹھ فٹ اور سطح سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے۔ صبح و شام سینکڑوں تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں اور جو تماشا وہاں انھیں نظر آتا ہے، الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصور کیجئے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور ان کے گرد کے اشجار و انہار، کوہ و ہاموں۔ شہر و قریہ سب وہاں سے نظر آتے ہیں اور یہ سین اہل نظر کے دل چھینے لیتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس سے ذرا اونچی چوٹیاں اسی کے قریب برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظر قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی ہیں اس جنت نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانہ ہوئی جاتی ہیں۔

" آہاہا ۔ ادھر دیکھنا کیسا دل فریب سین ہے ۔ اہوہو ۔ ادھر دیکھو کتنا پیارا نظارہ ہے ۔" ایشیائیوں میں اگر کوئی حسن قدرت کے مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو یا پیدا بھی کرلے تو یہ جوش کہاں سے لائے گا اور حسن قدرت کے روبرو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا ۔ یاں تو حسن چپ لگا دیتا ہے اور اس کا رعب مہرلب بن جاتا ہے ۔ ہم چپ چاپ اس عجیب نظارے کو دیکھا کئے اور اردگرد کے شور سے بے پروا ۔ شام تک اسی محویت میں پڑے رہتے اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی کہ شام سے پہلے واپس جا کر جھیل کے کنارے چراغاں کی سیر بھی دیکھنے کے لائق ہے ۔ اٹھے مگر بادل ناخواستہ۔ اسی چوٹی پر ایک بڑا عالی شان ہوٹل مسافروں اور تماشائیوں کے آرام اور تفریح کے لئے بنا ہوا ہے ۔ وہ سامنے تھا اس کی صورت اور اس کے خوش نما صحن میں میزوں کے اردگرد لوگوں کے جمگھٹے دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا کہ چلے کا وقت ہے ۔ وہاں چائے پی تازہ دم ہوئے اور ریل پر پہنچے ۔ واپسی پر ریل تیز تر چلی ۔ کوئی آدھ گھنٹے میں جھیل کے کنارے تھے ۔ وہاں کشتی فوراً مل گئی اور ہم اپنے قیام گاہ کے قریب آ پہنچے ۔ تھوڑی دیر تک کنار آب سیر کرتے رہے ۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے ۔ کھانا کھایا اور سو گئے کیونکہ سفر اٹلی درپیش تھا ۔

تھانیسر کی لڑائی اور اس کے اثرات

(منشی دیانرائن نگم)

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر میں ہوئی تھی، جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لئے گل کردیا اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لئے یہاں مضبوطی سے جمادئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوت عمل دے رکھی تھی اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے راستہ بھی کھول دیا تھا لیکن تھانیسر کی لڑائی سے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابل ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کی تاریخ پر پڑا۔ ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ھ میں سندھ پر قبضہ کرکے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔ لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔ دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے در پے حملوں کا ہے۔ مگر یہ بھی بادمخالف

کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا کیوں کہ محمود کی وفات کے چند ہی سال کے بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دہلی میں ایک طاقت ور سلطنت قائم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سر نو کھول کر آئندہ مسلمان حملہ آوروں کے لئے اس ملک میں داخل ہونے کی یقینی راہ دکھا دی۔ در اصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اسے ہندوستان خاص تک پہنچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہو کر سرہند تک پہنچ گیا جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے جس کی بدولت اکثر سلطنتوں نے اسے پایۂ تخت بنایا۔

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد و جواں مرگ بہنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بدھ مت کی بھکشنی ہو گئی اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رکھی اور آگے چل کر اس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسا ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔

دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلے کی آخری بھڑک تھی اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چند روزہ تھا جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب، معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا اور اس کا پولیٹکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔

اس وقت ہندوستان میں کئی طاقت ور اور راج پوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی، جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان دہلی اور اجمیر کے حکمراں تھے۔ راٹھوروں کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی، مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا اور پرتھی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر کے متصل ہی ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہو گیا تھا لیکن غوری کے دل میں یہ شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک، افغان اور

دیگر جنگ جو شامل تھے اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اس لئے حملہ آور راج پوتوں پر تھانیسر ہی کے میدان میں حملہ کر سکتے تھے۔ پرتھی راج متعدد راجاؤں اور بے شمار بہادروں کے ہم راہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لے کر ترائن کے میداں میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لئے آڈٹا۔ مگر اس بار راج پوتوں کی بہادری کام نہ آئی اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ راج پوت بہادری اور جاں بازی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر انھوں نے پچھلے تجربہ سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور وہ تمام غلطیاں دہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلے میں ہار چکے تھے۔ ان دونوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا لیکن ہندو سرداروں کو یہ گر معلوم نہ تھا کہ تیزی سے نقل و حرکت کرنے والے سواروں کے پے در پے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو پراگندہ کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہونے پر جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کام یابی سے روک لیا تو محمد غوری یہ ترکیب چلا کہ اس نے اپنی فوج کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے چار حصے کر کے چاروں طرف سے راج پوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راج پوتوں پر حملہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخر کار جب راج پوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیر اندازوں کو ساتھ لے کر ان پر لوٹ پڑا۔

راج پوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے۔ آخران کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ کھڑا ہوا تھا، لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگر جے چند والیٔ قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راج پوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راج پوتوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکا بنی رہے گی کہ اس نے ذاتی عداوت یا پولیٹکل رقابت سے متاثر ہو کر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنی ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقت ور تھی لیکن اس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پروا نہ کی۔ اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ مگر شدنی اٹل ہے۔ شروع سے لے کر اب تک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غدّاری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا۔ پرتھی راج کی شکست کے دو ہی سال بعد اس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد راج پوت وقتاً فوقتاً مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہو گئیں اور سلطان محمد غوری

قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کرکے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اس زمانے کے سماجک حالات کا مختصر بیان بے جا نہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے مستثنیٰ تھے۔ راج پوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا۔ ان کی بہادری بے نظیر تھی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کر جان بچانے سے وہیں جان دے دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن مصائب وحوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ان میں مادّہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لئے وہ ہر وقت مر مٹنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت وترقی کا انھیں چنداں خیال نہ تھا اور جتنا انھیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا، اس کا آٹھواں دسواں حصہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا۔ ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کشی بھی عیب نہ تھی۔ کم سنی میں شادی کردی جاتی تھی۔ ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم وادب کا عام چرچا تھا اور راج پوت راجوں، رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کئی حکمراں خود بھی شاعر اور مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگھٹن نہ تھا اور نہ عوام کی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ کی خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کردیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بدھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہنچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے سوشل نظام کو تہ و بالا کر دیا، اور ہندو مذہب، ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکا پہنچا، اور بے شمار ہندو مسلمان ہو گئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لئے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا۔ اس لئے سلطنت میں انقلاب ہونے کے باوجود مال گزاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو کاری گر ہی کام کرتے تھے۔ ہندو سنار ان کے سکّے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق ان کو مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے پر اثر ڈالے بغیر ایک جگہ کیوں کر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جو نہ خاص مسلم تھا نہ ہندوانہ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا، جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور سائنس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے، لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جس کا عام خیالات پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیرؔ اور گرو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایداس، داؤد، ملوک داس اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آکر ہندوستان

کے بہت سے مقامات میں پہنچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لئے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں بھی خالص ہندو طرز کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلم، پرانے طرز کی جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آرہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرز تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے۔ لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز میں شامل ہو گئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوق آرائش و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی۔ ہندو صنّاعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پرکاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ فن تعمیر کے خاص اسلامی جزو تھے، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس زمانے کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی

ہے۔ راج پوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور ناٹکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ شکل وصورت سے تو راج پوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کو ہندو مسلم آرٹ کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنتا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے اور انواع واقسام کے رنگوں کی حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لئے ہندی، مرہٹی، بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی، فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ، گرامر، تشبیہات اور طرز تحریر سب میں اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی، پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی "خالق باری" اسی اثر کا خوش گوار نتیجہ ہے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب لاکھ بخش ان دونوں زبانوں کے میل کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہل عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فن طب

کے مرہون منت ہو چکے تھے؛ لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس لئے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لیں اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں "تاجک" کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دوا سازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں جنھوں نے فن کاغذ سازی بھی چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس ملاپ کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگنیاں قبول کر لیں۔ لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ ردو بدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس، رسمیات، آداب محفل، غذا، کھانا پکانا، سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ حلوائی کی دکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہین منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے، دانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا۔ مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آج کل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری

نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچا قائم رکھا۔ اس کے سکوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

بلبن پہلا ترک حکمراں تھا جس نے عربی طرز کے سکے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سر نو جاری کیا۔ چنانچہ یورپ کی نئی ایجاد ترکوں ہی کے ذریعے ہندوستان میں رائج ہوئی۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا۔ اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری زندگی پر حاوی ہے اور آئندہ بھی عرصہ تک رہے گی۔

روپیہ عالم سکرات میں

(خواجہ حسن نظامی)

سونے کی اشرفی، چاندی کا روپیہ، تانبہ کا پیسہ، سب ہی سکرات کے عالم میں مبتلا ہیں۔ کس کس کے حلق میں پانی ٹپکائیں اور کس کس کے سرہانے بیٹھ کر کلمہ پڑھیں؟

پلو پچھتے پھرتے ہیں اب گنی کا کیا ہے بھاؤ جی
بند جب سونا ہوا اس وقت جاگے ساؤجی

یہ اس وقت کا شعر ہے جب کہ روپیہ اشرفی کو فقط نزلہ ہوا تھا۔ وبائی بخار کا کسی کو اندیشہ نہ تھا اور اب بھی روپیہ اشرفی کے لے پالک بچوں (کاغذی نوٹوں) کے سبب گھر میں چہل پہل کم نہیں ہوئی۔ اشرفی، روپیہ مرتے ہیں دم توڑتے ہیں بلا سے، ان کے "پالتو صاحب زادوں" کی بہتات سے گھر کی رونق جانے نہیں پائے گی۔

مجھے اس عارضی اور مجازی موت یا سکرات پر نظر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ میں نے اس خیال سے اس منظر کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا کہ روپیہ اشرفی کے دم نکلنے اور نوٹوں کے سر پر وراثت کی پگڑی بندھنے میں یہ یہ رسمیں اس اس طرح ادا ہوئیں۔

روپیہ کے لفظ سے میری مراد عام دولت ہے۔ خواہ وہ سونے کی ہو یا جواہرات کی، چاندی کی ہو یا تانبے اور نکل کی یا اور منقولی اور غیر منقولی جائداد کی ہو، مقصد یہ ہے کہ جس سرمایہ سے انسان روپیہ والا مشہور ہوتا ہے۔ اب روپیہ کی سکرات کا عالم آنے والا ہے۔ خبر نہیں روپیہ اس حالت نزع سے نجات پائے گا یا اس کی اجل آچکی ہے اور وہ واقعی مر جائے گا۔

ممکن ہے میرے اس اندیشہ کو انشاپردازی اور شاعری کہا جائے اور موت بیماری اور سکرات کو کوئی شخص امر واقعی تسلیم کرنے سے منکر ہو، مگر مجھ کو جو محسوس ہوتا ہے، وہی قلم پر آتا ہے۔

Imp.

عقل و علم کی انتہا یا عروج کے ایام میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو جاتی ہے جو دولت سے بے پروا، اور بعض حالتوں میں، اس سے نفرت کرنے والی نظر آتی ہے۔ یونان میں "کلبی حکماء" اسی قسم کے لوگ تھے، جو دولت اور اہل دولت سے بے زار، بے سرو سامان زندگی بسر کرتے اور دولت کے ملوث آدمیوں سے ان کا برتاؤ اس قدر برا اور سخت ہوتا تھا کہ عوام ان کو کٹ کھنا کتا کہتے تھے۔ اسی بنا پر اہل عرب نے اس جماعت کا نام کلبیہ (کتے والی) رکھا ہے۔ اسی جماعت میں دیو جانس کلبی حکیم گزرا ہے جو ایک چوبی ظرف سر پر رکھے رہتا تھا اور جب آرام کرنا چاہتا تو اسی ظرف میں سکڑ کر لیٹ جاتا تھا۔ بس یہی اس کا مکان تھا اور یہی اس کی

دولت تھی۔ سکندر نے جب اس کا شہر فتح کیا تو یہ اپنے چوبی پیالہ میں پڑا سوتا تھا۔ سکندر اس کے سرہانے گیا اور لات مار کر کہا۔" اٹھ میں نے تیرا شہر فتح کر لیا" دیو جانس نے پڑے پڑے جواب دیا "ملک فتح کرنا بادشاہوں کا کام ہے اور لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے۔"

یہی دیو جانس کلبی تھا جس کے پاس ایک دن سکندر گیا اور کہا کہ مجھ سے کچھ ضرورت ہو تو فرماؤ تاکہ اس کو پورا کردوں۔ حکیم نے کہا۔"بس یہی ضرورت ہے کہ آپ دھوپ چھوڑ کر ذرا پرے ہٹ جایئے۔

اس بے پروائی اور بے باکی کو دیکھ کر سکندر نے کہا تھا کہ" اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیو جانس ہوتا" اس فرقہ کی یہی بے نیازیاں اور بے باکیاں تھیں جن کے سبب وہ کٹ کھنے کتے کہلائے تھے۔

ہندوستان میں جب عقل و علم کا عروج ہوا تو ایسا تارک دنیا گروہ پیدا ہو گیا تھا، جو اسباب دولت کو زندگی اور اس کی خوشی کے لئے ضرور نہ سمجھتا تھا اور خوشی اور اطمینان کو ترک دولت سے حاصل کرنا اچھا خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اور ترقی کی اور یہ خیال پھیل گیا کہ دولت اطمینان اور خوشی کی دشمن ہے اور جہاں یہ ہو وہاں راحت و تسلی کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ شانتی، ترک تعلقات اور ترک اسباب دنیا سے حاصل ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بانیٔ اسلام شروع سے دولت کی ناجائز محبت کے مخالف تھے اور قرآن میں خدا نے بھی اسباب دولت کی محبت سے ان کو روکا تھا۔ مگر قرآن کی تعلیم، اپنی علمی واعتدالی عادت کے موافق بالکل ترک کا حکم نہ دیتی تھی۔ اس کا منشا صرف یہ تھا کہ ضروریات زندگی کے لئے دولت حاصل کرو مگر دولت کو زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔

مسلمانوں پر شروع کا زمانہ اسباب دولت کے اعتبار سے بھی نہایت سخت تھا۔ ان کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھکنے کو پورا کپڑا میسر نہ آتا تھا۔ ان کے پاس جنگ کے ہتھیار اور دیگر لوازمات بھی پوری طرح نہ تھے۔ ان کے رسولؐ فاقے کرتے تھے یا جو کا بے چھنا آٹا کھاتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں اور وہ ملکوں کے مالک بن گئے تب بھی انھوں نے تیس برس تک اپنی فقیرانہ زندگی کو نہ بدلا اور دولت کی محبت کو پاس نہ آنے دیا۔

یورپ وامریکہ کی عقلی اور عملی ترقی کا دور آیا، تو اس نے اپنی ہر ترقی کا مطمح نظر دولت کو قرار دیا۔ حکومت میں دولت تجارت میں دولت، طبابت میں دولت، تعلیم میں دولت، تفریح میں دولت، غرض کوئی دینی اور دنیوی کام ایسا نہ بچا جس میں دولت مقصود اصلی نہ سمجھی گئی ہو۔

کوئی ایجاد ہوئی تو دولت کمانے کا خیال مدنظر رہا، کوئی علمی درس گاہ قائم ہوئی تو اس میں سوچا گیا کہ ترقی دولت کے

لئے کیوں کر یہ کار آمد ہو سکے گی۔ اس دولت پرستی کی اتنی کثرت ہوئی کہ یورپ و امریکہ کی تمام دماغی قوتیں دولت جمع کرنے میں مصروف ہوگئیں اور انھوں نے دولت کے پہاڑ جمع کر لئے۔

مگر باوجود اس کے کہ وہاں کا ہر فرد دولت کمانے اور جمع کرنے میں مصروف نظر آتا تھا، بے شمار غریب اور بے دولت بھی ان میں باقی رہے اور دولت تمام افراد میں برابر اور مساوی تقسیم نہ ہو سکی۔

یورپ و امریکہ نے علمی ترقی کے دوران میں تمدنی اور معاشرتی ترقی بھی کی تھی۔ اور اپنی بود و باش کو اتنا مکلف اور آراستہ بنایا تھا کہ ایک آدمی کو صبح، دوپہر، شام، رات، کھانے، سونے اور ملنے جلنے کے لئے بے شمار کپڑے پہننا پڑتے تھے اور کھانا اگر کوئی آدمی چار آنے کا کھاتا تو میز اور برتنوں اور دیگر سامان آرائش میں چار روپے خرچ کرنے پر مجبور تھا۔ اس واسطے ان کو رات دن دولت کمانے کی ضرورت رہتی تھی۔ تمدن اور معاشرت کے ان لا انتہا تکلفات کا مقصد عیش تھا۔ لطف خوشی کا ایک ٹکڑا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علم دولت کے لئے دولت عیش کے لئے اور عیش خوشی کے لئے۔ حکومت دولت کے لئے، صنعت و حرفت و تجارت و طبابت وغیرہ بھی سب دولت کے لئے اور دولت عیش کے واسطے اور عیش کا مقصد خوشی۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے، جو خوشی اور اطمینان نہ چاہتا ہو۔ جو لوگ دولت کو مقصود زندگی اور مطلوب زیست

نہیں سمجھتے، وہ بھی خوشی کے طلب گار نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی خوشی دولت اور پھر عیش کے دور دراز راستہ سے نہیں آتی بلکہ ایک بہت قریبی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے جہاں دولت اور تکلفات کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سوامی رام تیرتھ جب امریکہ گئے اور وہاں کے پہلے ریلوے اسٹیشن پر ان کو ایک امریکن اخبار نویس نے بے سروسامان دیکھا کہ سوا بدن کے کپڑوں کے اور کچھ اسباب ان کے پاس نہیں ہے تو اس نے تعجب سے پوچھا کہ تمھارا اسباب کہاں ہے؟ سوامی جی نے جواب دیا "رام بے اسباب آیا ہے اور بے اسباب جائے گا"۔

ایڈیٹر نے کہا "اس ملک میں بے اسباب بھوکا مر جاتا ہے اور رہنے کو جگہ نصیب نہیں ہوتی"۔ سوامی جی نے جواب دیا "دریا کا ریت میرا بستر ہے اور جنگل کے پتے میری خوراک ہیں۔ تم میرے لئے مکان و خوراک کی فکر نہ کرو"۔ اور یہی ہوا کہ جب امریکہ میں ان کے لکچر ہوئے تو امریکہ کی دولت ان کی طرف دوڑتی تھی اور وہ اس سے بھاگتے تھے۔ سوامی رام تیرتھ کی خوشی لامحدود تھی حالانکہ ان کے پاس دولت نہ تھی اور دولت کا تمدنی سامان نہ تھا۔ سوامی رام تیرتھ کی خوشی اور مطمئن زندگی پر امریکن دولت رشک کرتی تھی اور اس کے قدموں پر گری پڑتی تھی اور اس کا گرنا اس لئے تھا کہ سوامی جی دماغی اور روحانی کمال رکھتے تھے، گو دولت ان کے پاس نہ تھی۔

گزشتہ جنگ یورپ کا اصلی سبب بھی دولت پرستی تھی۔ ہر قوم

اپنی تجارت کے فروغ کی خواہش مند اور اس کے خارج راستوں کو صاف کرنا چاہتی تھی اور اب جب کہ صلحکان فرنس کی مجلسیں گرم ہیں تب بھی دولت پرستی کا خیال ہر قوم کے سامنے ہے۔

یورپ و امریکہ میں خود غرضانہ دولت جمع کرنے کی اندھادھند عادت اور بے انتہا طمع کو دیکھ کر وہ گروہ جو قدرتی طور سے غریب اور نادار ہے باوجودیکہ یورپ اور امریکہ میں دولت کے دریا بہتے تھے اس نے سوشلسٹ کے نام سے اپنی ایک جماعت قائم کرلی، جو رفتہ رفتہ تمام یورپ وامریکہ اور ایک حصہ ایشیا میں پھیلنے لگی۔

آخر قدرت نے دولت اور دولت مندی میں ایک متعدی وبا بھیجی جو رفتہ رفتہ دولت کو فنا کرتی جاتی ہے۔ دولت کی موت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ دولت تباہ ہو جائے یا اس کا حاصل کرنا ترک کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کو زندگی کا اصلی مقصود نہ سمجھا جائے اور عزت اور خوشی کی خرید دولت پر منحصر نہ رہے۔ نہ یہ ہو کہ ایک آدمی تو اتنا دولت مند ہو جائے کہ اپنے خزانوں کا شمار نہ کر سکے اور لاکھوں آدمی اس کے محتاج ہوں اور اس کی دی ہوئی مقررہ اور بہت کم روٹی کھانے پر مجبور کئے جائیں۔ سوشلسٹ جماعت کا اصول سب کو معلوم ہے کہ وہ دولت کی بے تحاشا حرص اور اس کے خزانے جمع کرنے کے خلاف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ چند افراد تو عالی شان محلوں میں رہیں، عمدہ عمدہ کھانے کھائیں اچھے اچھے کپڑے پہنیں۔ بڑھیا بڑھیا سواریوں میں سوار ہوں بے شمار خزانہ رکھیں اور ان کے لاکھوں بھائی نہ اچھا اور پیٹ

بھر کر کھانا کھا سکیں نہ پوری طرح سردی و گرمی کے بچاؤ کے قابل ان کو کپڑا مل سکے، نہ زندگی کی معمولی ضروریات ان کو نصیب ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دولت اور معیشت میں سب انسان برابر رکھے جائیں۔ سب کو مکان، کھانا، کپڑا اور ضروریات زندگی مساوی شان کی حاصل ہوں وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے حالات اور لیاقت کے بموجب ہر شخص محنت کرے اور کوئی شخص بے کار و کاہل نہ رہے گویا محنت بھی مساوی، معیشت بھی مساوی، دولت بھی مساوی کرا دینا ان کا مقصد ہے۔

میرے عنوان کے لحاظ سے ان کا یہ اصول قابل غور ہے کہ وہ روپے کو عزت اور خوشی کا ذریعہ نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم اپنے موجودہ حکم رانوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں روپیہ والا ہونا عزت کا موجب ہے۔ علم و عقل کی، شرافت کی، کچھ پرسش نہیں ہے۔ بہت جاہل، بہت احمق۔ بہت کمینے۔ بہت بد اعمال لوگ دولت مند ہونے کے سبب حکومت میں معزز سمجھے جاتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ ٹیکس دیتا ہو وہ سب سے زیادہ عزت دار ہے۔ خطابات بھی دولت کے انبار والوں کو عموماً زیادہ ملتے ہیں۔ ہماری حکومت کا ذاتی قصور نہیں ہے، بلکہ یورپ کی مروجہ رسم زندگی ہی یہ ہے کہ دولت کو عزت و آبرو سمجھا جاتا ہے۔

وہ (سوشلسٹ) یہ بھی جانتے ہیں کہ روپے کے زور سے حکومت جو کی جاتی ہے اس کو بدل دینا چاہیے اور روپیے کو انسان پر کسی حیثیت سے کسی قسم کی فوقیت و حکومت نہ دینی چاہیے۔

آج کل روپیہ یا عدالت ہر اعتبار سے آدمیوں پر قابض ہے اور آدمی کی عقلی و ذہنی و علمی قوتیں روپیہ کی قوت سے مغلوب نظر آتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں تو صرف خدا کی طلب اور عالم آخرت کی تلاش کے مقصد سے، عقلی عروج کے تقاضے سے دولت کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور اس کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی تھی، جیسا کہ فلاسفروں اور حکیموں اور سنیاسیوں اور صوفیوں کی حالت تھی۔ اس واسطے دنیا میں روپیہ کی مغلوبیت ایک محدود جماعت میں نظر آتی تھی۔

مگر روپیہ کے غلبہ نے تمام دنیا کی زندگی کو بے چین کر دیا ہے اور ہر قوم روپیہ کی غلامی سے دق اور پریشان ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ جو خود دولت مند ہیں وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ دولت کا حصول اور اس کا سنبھالنا، ان کی خوش باش زندگی کے لئے ایک وبال جان ہے اور کوئی لمحہ بھی خوشی کا روپیہ والوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یورپ اور امریکہ کی شہری زندگی سوسائٹی کی زنجیروں سے مرتب ہوتی ہے اور روپیہ ہر سوسائٹی کو مرتب کرتا ہے اور روپیہ کی ترتیب ایسے خود مختار اور جبار حاکم کی شان رکھتی ہے کہ وہ سب سوسائٹیاں باوجود دعویٰ آزادی کے روپیے کی بدترین غلام بنی ہوئی ہیں اور ان کی تمام افراد اس سفاک بادشاہ کی محکومیت سے نکلنا چاہ رہی ہیں۔ خواہ وہ جدید تحریکوں سے ہمدردی نہ رکھتی ہوں، خواہ ان کو اشتراکیت کے اصول سے سراسر نفرت اور عداوت ہو، مگر وہ اس امر کو

دل سے محسوس کرتی ہیں کہ روپیے کی سلطنت نے انسان کی اصلی انسانیت کو شل کردیا ہے اور انسان کی وہ اعلیٰ قابلیت جس سے وہ حقیقی انسان اور خوش باش انسان نہیں بن سکتا ہے روپیے کے جبریہ اور فولادی پنجہ سے جکڑی ہوئی ہے، اور اس کو آزاد ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔ روپیہ انسان کا غلام ہوکر رہے نہ کہ آقا بن کر۔ روپیہ کو آدمی کا تابع دار و خدمت گار ہونا چاہیئے مگر وہ اس کا سرکش مالک بنا ہوا ہے۔ روپیہ اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کو انسان کے مقصدی راستہ سے الگ ہٹ کر آباد ہونا چاہیئے کہ آدمی کسی کام کے لئے پیدا ہوا ہے۔

دنیا کی موجودہ حالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ روپیہ کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور جن دولت پرست دماغوں نے دولت کے نشے میں بہک کر کروڑوں بے دولت دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے وہ دوامی طور سے حاکم نہیں رہ سکتے اور ان کو عنقریب دولت کے غلبہ سے دست بردار ہونا پڑے گا اور ان کی حاکمی دولت کے پنجہ اور دولت کے دکھاوے سے نہ ہوگی بلکہ اس کی صورت بدل کر دولت کی محکومیت کی شکل میں آجائے گی اور اس کو دولت کی موت کہنا چاہیئے۔

میں نے لکھا ہے "روپیہ عالم سکرات میں" اس کا مقصد یہی ہے کہ روپیہ گو ابھی تک زندہ ہے لیکن اس کی زندگی چند سانس کی باقی رہ گئی ہے اور اپنی معاشی اور تمام ضروریات زندگی میں اس کا جسم اپنی حاکمانہ و مختارانہ روح سے خالی

ہونا چاہتا ہے۔

مذہب، خواہ کوئی ہو، یہی کہتا ہے کہ اے آدمی! دولت کا حاکم بن، محکوم نہ ہو۔ مگر مذہب کو مذاق میں اڑا دیا گیا اور معیشت کی ضرورت نے انسان کو پریشان کر کے آخر اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ دولت کی محکومیت ترک کرے اور حاکمیت پر پہنچے۔ گو ابھی تک دنیا کی بسر اوقات کا سارا چہرہ دولت اور روپیہ کا اسیر نظر آتا ہے اور روپیہ کی جاں کنی پر یقین کرنا دشوار ہے لیکن جن کو انسانی جنس کی جسمانی اور جسم کے اندر کی باطنی حالت کا علم ہے، یا وہ اس پر غور کرتے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ روپیہ جاں کنی اور سکرات کے عالم میں مبتلا ہے اور کچھ دیر کے بعد مر جائے گا۔

Ump.

جنگ کا اثر اخلاق پر

(مولانا ابو الکلام آزاد)

دنیا کے گوشے گوشے میں قوت کا خزانہ پنہاں ہے۔ بجلی کی رو خاک کے ہر ذرّے میں موجود ہے۔ نمو کی قوت زمین کے چپّے چپّے میں مخفی ہے۔ موجوں کا تلاطم ہر دریا کے اندر چھپا ہوا ہے لیکن یہ قوتیں خود بخود نہیں ابھرتیں، بلکہ اپنے ظہور کے لئے ایک سخت کشمکش، ایک سخت مقاومت ایک سخت تصادم کی منتظر رہتی ہیں۔ پس جب کوئی قوت ان کو ٹھوکر لگا دیتی ہے، تو وہ برہم ہو کر اپنے چہرۂ تاب ناک سے نقاب الٹ دیتی ہیں۔ حرکت بجلی کے خزانہ میں آگ لگا دیتی ہے۔ سیلاب کی رو زمین کی قوتِ نمو کو اُبال دیتی ہے، ہوا کے جھونکے سطحِ دریا پر موجوں کا جال پھیلا دیتے ہیں۔

اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون و ارواح میں چھپی ہوئی ہے۔ لیکن اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو وہ مشام جان کو معطّر نہیں کر سکتا، اس کی بوئے جاں فزا بار بار کے ہلنے ہی سے پھیلتی ہے۔ اسی طرح اگر انسان تمام دنیا سے الگ ہو کر ایک قلّۂ کوہ پر عزلت گزینی اختیار کرے تو اس کا اخلاقی جوہر ہمیشہ

کے لیے پہاڑ کے تاریک غاروں میں چھپ جائے گا۔لیکن خدا نے انسان کو اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی بنا پر انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق قرار دیا۔ وہ خود بھی دنیا کے منظر عام پر نمایاں ہوئے اور اپنی امت کو بھی نمایاں کیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کی نمائش وادی تیہ میں کی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مقصد کے لئے ایک وادیِ غیر ذی زرع کو منتخب فرمایا، اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کائنات عالم کے ہر میدان میں اپنا اور اپنی امت کا اُسوۂ حسنہ پیش کر دیا۔ اسلام نے اسی اصول کی بنا پر رہبانیت کو ناجائز قرار دیا۔کیوں کہ انسان کا اخلاقی جوہر بھی دنیا کی دوسری قوتوں کی طرح تصادم وکشمکش ہی کے ذریعہ نمایاں ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چوں کہ انسان کو اخلاق حسنہ کا مظہر بنایا ہے، اس لئے اس نے ایسے اسلوب مہیا کر دیے جو انسان کے حاشیۂ اخلاقی کو ہر وقت نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک شخص گھر میں ہے تو اعزا واقارب کے تعلّقات سے اس کے اخلاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر بزم احباب میں ہے تو دوستوں کے اختلاط وارتباط کو اس کے اخلاق کا معیار بنایا جاسکتا ہے، اگر وہ کسی بازار میں ہے تو معاملات کے ذریعہ سے اس کے عیب و ہنر نمایاں ہو سکتے ہیں۔

لیکن جنگ ایک ایسی سخت ٹھوکر ہے، ایک ایسا سخت زلزلہ ہے۔ ایک ایسا سخت دھاکا ہے جس سے دنیا کا ایک ایک ذرہ جنبش میں آجاتا ہے اور اس کی تمام قوتیں دفعۃً متحرک ہوجاتی ہیں۔

اخلاق بھی ایک عظیم الشان قوت ہے اس لیے وہ بھی جنگ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اس کے اثر سے انسان کے نظام اخلاق میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی علت ہے کہ اسلام نے اپنے تمام اعمال تربیت کے لئے اخلاقی موثرات میں سے صرف جہاد ہی کو منتخب کیا، کیوں کہ اخلاقی انقلاب کا اس سے زیادہ کوئی موثر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

زمانۂ جنگ میں عارضی طور پر انسان کا نظام اخلاق دفعۃً بدل جاتا ہے، یہاں تک کہ عیب ہنر اور ہنر عیب ہو جاتا ہے۔ تجسس ایک سخت بد اخلاقی ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں جاسوسی ایک ہنر خیال کی جاتی ہے، اور اس کے لیے بہترین قابلیت کے اشخاص منتخب کئے جاتے ہیں۔ صیانت نفس ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے، لیکن میدان جنگ میں فرار انتہا درجہ کی بد اخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ محاسن اخلاق میں رحم دلی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، لیکن صف دشمن میں اس کی کوئی قدر دانی نہیں کی جاتی۔ غیروں کے حقوق کی حفاظت، تمدن و قانون کا بہترین کارنامہ ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں قانون ہی غیروں کے ملک کا دوسری سلطنتوں کے ساتھ الحاق کر دیتا ہے اور مال غنیمت جس طرح وحشی قوموں کے لیے ذریعۂ معاش تھا، اسی طرح تمدن کا بھی بہترین اندوختہ بن جاتا ہے۔ امن کی حالت میں عفو و درگزر، حلم و تحمل، اپنے اندر ایک اخلاقی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں لیکن صف جنگ میں طلاقت وجہ اور حلم آمیز تبسم سے زیادہ زشت روئی کی قدر

کی جاتی ہے۔ کفایت شعاری نہایت عمدہ چیز ہے لیکن میدان جنگ صرف اسراف ہی کے ذریعہ سے فتح ہو سکتا ہے۔ وفائے عہد کی اخلاقی عظمت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں سیکڑوں بد عہدیاں جائز خیال کی جاتی ہیں۔

اس قسم کے سیکڑوں اخلاقی عیب و ہنر ہیں جن کی حقیقت زمانۂ جنگ میں بالکل بدل جاتی ہے، اور ضرورت ان کے بدل دینے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن ابتدا میں دنیا کی ہر چیز عارضی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ عارضی اسباب سے زمین پر پانی کے قطرے گرتے ہیں، اور آہستہ آہستہ زمین میں سوراخ کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن وہ مستقل گڑھے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک پتھر پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں اور وہ ان کا رنگ جذب کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن لعل شب چراغ کے قالب میں نمایاں ہو کر دنیا کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے۔

انسان کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ سے ایک سادہ شیشۂ دل لے کر آتا ہے، جس میں ہر عکس کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ دنیا کی جو طاقت اس پر اپنا پرتو ڈالتی ہے، آہستہ آہستہ اسی اثر کو قبول کرتا جاتا ہے، اور اسی قوت کا مجموعی اثر اس کا اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق کا سب سے بڑا مظہر عادت ہے، لیکن یہ ملکہ بھی کسی فعل کے متواتر عمل میں لانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اس عالم گیر قدرتی اصول کی بنا پر جن قوموں کو جغرافیانہ حالت، تمدّنی ضرورت اور قومی خصوصیات ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رکھتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ میدان جنگ میں بسر کرتی ہیں یہی عارضی نظام اخلاق ان کا مستقل اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے، اور وہ ان اخلاقی خصوصیات میں تمام دنیا سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔ ترکوں کی جنگ جوئی عام طور پر ضرب المثل ہے۔ ع :-

چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغمارا

زمانۂ جنگ میں جن اخلاق و عادات کو ناگزیر خیال کیا جاتا ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جن سے بلا تکلف بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے۔ جنگ کے لئے اگرچہ جاسوسی ایک ضروری چیز ہے لیکن جاسوس فوج کے ضروری اجزا نہیں ہو سکتے۔ میدان جنگ میں کبھی کبھی دشمن پر رحم بھی کیا جا سکتا ہے، فقر و فاقہ کی حالت میں بھی جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے، اور دولت کی بارش اس کے لیے ضروری نہیں، لیکن "شجاعت" ایک ایسی چیز ہے جو جنگ کی حقیقت میں داخل ہے، اور اگر کوئی شخص میدان میں عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا رہنا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے اپنے پاؤں میں اس کی سنہری زنجیر ڈال لینی چاہیے۔

جن قوموں کو کسی اتفاقی ضرورت سے لڑنا پڑتا ہے، اگرچہ ان کے لیے ایسی شجاعت نہایت ضروری ہے، لیکن جو قومیں

ہمیشہ لڑتی بھڑتی رہتی ہیں، ان میں شجاعت کا ایک مخصوص ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے وہ خاص طور پر اس وصف میں دوسری قوموں سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔

مرد عورتوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے مختلف لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، یہی کشمکش ان کے جذبات شجاعت کو زیادہ نمایاں، اور مستحکم کر دیتی ہے۔

لیکن اگر متمدن اور وحشی قوموں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں بھی مرد اور عورت کی سی نسبت نظر آئے گی۔ متمدن قوم ایک عظیم الشان شہر کی چار دیواری میں محصور رہتی ہے، اس کو خارجی خطرات کا بالکل ڈر نہیں رہتا۔ شہر کے اندر پولیس حفاظت کرتی ہے، وہ امن و سکون کی حالت میں آرام کی نیند سوتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کی قوت دماغی بے کار ہو جاتی ہے اور شجاعت کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایک بدوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کھلے ہوئے میدان میں رہتا ہے اور اپنی تمام چیزوں کی حفاظت خود ہی کرتا ہے۔ چور ڈاکو، غنیم اس پر حملہ کرتے ہیں اور وہ صرف اپنی قوت بازو سے ان کو دفع کرتا ہے۔ اس لیے اس کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ ٹھوکر لگتی رہتی ہے اور اس سنگ چقماق سے ہمیشہ شرارے نکلتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے پہلو میں ایک گرم دل، اور دل میں گرم خون کا ایک

بڑا ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہی خون اس کی رگوں میں ہر وقت حرکت پیدا کرتا رہتا ہے، اور وہ ایک معمولی سی صدا پر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

عرب جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کو دفعۃً الٹ دیا اسی قسم کی شجاعت کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت میں بہادروں کا ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو ہمیشہ گھوڑے کی لگام زنار کی طرح اپنے گلے میں آویزاں رکھتا تھا، اور ہر وقت میدان جنگ کے لیے پا بہ رکاب رہتا تھا۔ فارسی لٹریچر میں "پا بہ رکاب" کے استعارے کو بھی جنگ ہی کی عاجلانہ مستعدیوں نے پیدا کیا۔

لیکن کبھی کبھی صرف ایک ہی ممتد اور عظیم الشان جنگ اس قسم کی مستقل شجاعت پیدا کر دیتی ہے۔ فتح و ظفر کی نشاط انگیز مسرت اس آتش سیال کو اور بھی دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ آج ہمیں کئی قومیں ایسی نظر آتی ہیں جو اگرچہ ہمیشہ مصروف جنگ نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی فاتحانہ جنگی اقدام یا ایک ہی بامراد معرکۂ قتال نے ان کو ایک مستقل اور دائم و قائم جنگی قوم بنا دیا ہے۔

تاتاریوں کی مشہور شجاعت بھی اسی عالم گیر طوفان کی ایک موج ہے جو ساتویں صدی میں تمام دنیائے اسلام میں پھیل گیا تھا اور بعد کی صدیوں میں ہجوم اعدا نے اس کو اور بھی مستقل کر دیا۔

اس مستقل شجاعت کا اثر صرف میدان جنگ ہی میں ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبۂ عمل میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ تمام قوم میں ایک حرکت پیدا کر دیتی ہے جو اس کے

تمام قوائے خفتہ کو بے دار رکھتی ہے۔ جرمنی کی جنگ پرستی کا نقشہ فرانس و بلجیم کے میدانوں سے زیادہ برلن کے کارخانوں، کالجوں، عام بازاروں میں نظر آیا تھا۔

قوی کا یہ نشاط قوموں کی افزائش نسل پر نمایاں اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیر کی ابھرنے والی بہادرانہ قوت جب ایک پنجرے میں قید کردی جاتی ہے تو اس کا شجاعانہ نشاط فنا ہو جاتا ہے اور اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس بزدل قوم قلیل النسل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت کی غلامی کا افسردہ کن امن مفتوح قوموں کو فنا کر دیتا ہے۔

لیکن ایک ہی قوت متضاد نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پانی کی طغیانی اگر سطح دریا پر موجوں کے سر پر غرور کو بلند کر دیتی ہے تو بہت سے سر اٹھانے والے کنگرے اس کی رو میں پست بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جنگ اگر ایک قوم کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ کے لیے ابھار دیتی ہے تو دوسری قوم کو ہمیشہ کے لیے بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ شخصی حالتوں میں بھی یہ بزدلی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

انگلستان کے مشہور فلاسفر ٹامس ہوپ نے اپنی بزدلی کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہ جس زمانے میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا انگلستان کو ہسپانوی لوگ جنگ و غارت گری کی دھمکیاں دیتے رہتے، اور ان کی فوجیں عموماً ساحل انگلستان کا چکر لگایا کرتی تھیں۔ اس وقت تمام انگلستان کے ساتھ اس کی ماں بھی

اضطراب وخوف میں مبتلا تھی۔ اس کے اضطراب عصبانی نے بچے میں یہ بزدلی پیدا کردی۔

انگلستان کے سلاطین قدیم میں یعقوب ثانی سخت بزدل تھا اس کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ماں نے سخت مصیبت واضطراب کی حالت میں زندگی بسر کی تھی، اور اس کا قدرتی اثر اس کے بچہ پر بھی پڑا تھا۔

اردو کیونکر پیدا ہوئی

(مولانا سلیمان ندوی)

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی پچیس[۲۵] سالہ یادگار مجموعہ میں جولائی ۱۹۳۳ء میں چھپا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہوا ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک میں کبھی ایک بولی نہیں بولی گئی۔ درحقیقت یہ ملک ایک بر اعظم ہے جس میں ہر زمانے میں مختلف قومیں اور مختلف نسلیں جو مختلف بولیاں بولتی تھیں، آباد تھیں، آباد ہیں اور آباد رہیں گی۔ دنیا کی زبانوں کی تین مشہور اصلیں آریائی، تورانی، اور سامی تینوں یہاں دوش بدوش ملی جلی ملتی ہیں، ڈریویدی زبانوں کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبوں کی دوسری زبانیں آریائی ہیں اور عربی کی شمولیت سامی کا نتیجہ ہے۔

چند مشہور راجاؤں کے زمانوں کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصوں پر حکمراں رہے، ہندوستان کا اکثر یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے، مختلف مستقل ریاستوں کی صورت میں رہے۔ ان صوبوں کی وسعت راجا کی قوت اور فتوحات کے دائرے کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ ہر ریاست کی زبان اس کے صوبے کی

مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا، اسی حد تک اس زبان کا جغرافیائی دائرہ کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتا ہے۔

مثالاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی، برج کی بھاشا، مگدھ کی زبان، اطراف دہلی کی ہریانی یہ چاروں ہم سایہ ہیں، مگر ان کی حدیں اپنی سلطنتوں کی حدوں سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا جب ہندوستان پر چھا گئی تو اس کی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بن گئی، اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لے کر مہاراشٹر کے کناروں تک ملتے ہیں۔

ہندوستان میں سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں کے جہازوں کا گزرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیوں کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے، خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جز بنتا اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جارہی ہیں۔

بہر حال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لے کر گجرات تک دسیع تھا۔ اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتویں صدی عیسوی میں فارس کی فتح کے بعد عربوں نے بھی ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے

سندھ پر قبضہ کیا اور ان کے جہازات خلیج فارس کے ابلہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہوں سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملی بار ہو کر چین تک جانے لگے۔ ان جہازوں کے چلانے والے فارسی و عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہوں سے یہ گزرتے ہوں وہاں ان کی زبانوں کے کچھ الفاظ مستعمل ہو جائیں اور وہاں کی مقامی زبانوں کے کچھ لفظ ان جہازیوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازوں کے ذریعہ ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر کے بندرگاہوں تک پہنچ گئی ہے اور خود مجھے عدن، جدہ، پورٹ سعید مصوّع اور پورٹ سوڈان میں ہندوستانی بولنے والے ملّاح اور دوکان دار ملے۔

اس موقع پر ہمارے سامنے سب سے پہلا بیان ایک ملے جلے ایرانی عرب جہازراں بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازراں ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ

"میں ۲۸۸ھ میں منصورہ (بھکر) میں تھا وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے یہ بیان کیا کہ الرا (الور) کے راجا نے جو ہندوستان کا بڑا راجا تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے بیچ میں تھی اور جس کا نام مہروگ بن رائق (؟) تھا، ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اس کو بتائے تو عبداللہ نے منصورہ میں ایک عراقی کو پایا جو بہت

تیز طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر تھا اور جس نے ہندوستانیوں میں نشو و نما پائی تھی اور جو اہل ہند کی مختلف زبانوں سے واقف تھا اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجا کو بھیجا۔ راجا نے اس کو بلا بھیجا اور اس کے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہو گا کہ ہندوستان کے سواحل میں بھی بہت سی مختلف زبانیں تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بولتے تھے اور ان میں یہ لیاقت رکھتے تھے کہ وہ ان میں شاعری کر سکتے تھے اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کر سکتے تھے۔

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفر ناموں اور تاریخوں میں مذکور ہے۔ اس واقعے کا زمانہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے۔

اس کے ۳۲ برس کے بعد ۳۰۳ھ میں مسعودی ہندوستان آتا ہے۔ وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے:۔

"اس کے بعد ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی، تو سندھ پر ایک راجا بنا اور قنوج پر دوسرا راجا ہوا، اور کشمیر میں تیسرا راجا تھا اور مانگیر (مانکھیڑ) پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات اور کاٹھیاواڑ) بلہرا (ولبھ رائے) کی حکومت ہوئی اور اب تک ہمارے زمانے تک جو

سنہ ۲۳۲ھ ہے یہ راجا اسی لقب سے ملقب ہے اور ہند کی زمین بہت وسیع ہے، خشکی، پہاڑ اور دریا میں پھیلی ہے۔ ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ) سے ملتا ہے جو جزیروں کے بادشاہ "مہراج" کا دارالمملکت ہے اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہے لیکن ہندوستان کی طرف منسوب ہے اور دوسری طرف کوہستان سے متصل خراسان اور سندھ اور تبت تک ہے، اور ان (ہندوستانی) ریاستوں میں باہم اختلاف اور لڑائیاں ہیں اور ان کی زبانیں الگ الگ ہیں اور ان کے مذہبی خیالات مختلف ہیں، زیادہ تر لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے۔"

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال میں کہتا ہے :۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے .... اور مانگیر (مانکھیڑ) کی زبان جو بلہرا (ولبھ رائے) کا دارالسلطنت ہے گیری ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس) کی زبان لاری ہے۔"

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانوں کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے جو سنہ ۳۴۰ھ میں آیا تھا وہ کہتا ہے :۔

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں

کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔"

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفر نامے میں ملتے ہیں۔اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہے وہ کہتا ہے:۔

"منصورہ (بھکّر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔"

۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں بشّاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال میں لکھتا ہے:۔

"اُردو اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔"

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ کے بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے:۔

"دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چاروں طرف سوگانوں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے سب سوداگر ہیں ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔"

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے، سندھ کی زبانوں کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے:۔

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہب والے ہیں اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہیں۔ مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ ان کے یہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں۔ میں نے (بغداد کے) قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے

کہا گیا کہ یہ بودھ کی مورت ہے، ....
.... اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا۔"

اب وہ زمانہ آیا جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا اب ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا۔ اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنیں میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے۔ آمد و رفت، لڑائی بھڑائی اور صلح و پیام کے لیے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آگیا تھا۔ اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان و ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے۔

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شدند از ہند و خلج و از ہر دستی۔"

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم "تلک" نام ایک ہندو تھا جو بچپن میں شیراز پہنچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی۔

"خطے نیکو بہ ہندی و فارسی می داشت و مدتے دراز بہ کشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ داو را دبیری و مترجمی کردے با ہندواں"

ابو الفضل بھی اپنی تاریخ آل سبکتگین میں اپنے زمانے یعنی سلطان مسعود سنہ ۴۲۱ھ سنہ ۴۳۲ھ کے عہد میں اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا۔

"ہم چناں بیربل بریوان ما"

سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجا نندا نے ۴۱۳ھ میں جب سلطان کی شان میں ہندی شعر لکھ کر بھیجا اس موقع پر فرشتہ میں لکھتا ہے۔

"نندا بہ زبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزداو فرستاد سلطان آں را بہ فضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفریں کردند"

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں بھی سلطان کے دربار میں عرب و عجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھیں اور مزہ لیں۔

غزنوی بادشاہوں کے زمانے میں جب پنجاب، غزنین کا صوبہ تھا، ہزاروں لاکھوں مسلمان جن کی زبان فارسی تھی پنجاب میں بس گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں اور عام اہل ہند میں بول چال اس طرح ہو گی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہوں، اور چند روز میں یہ کیفیت ہو گئی کہ مسلمان ہندی میں یا فارسی آمیز ہندی میں شاعری کرنے لگے چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ نے جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اور لاہور ہی میں رہتا تھا، ایک دیوان عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا یادگار چھوڑا۔

"یکے بتازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندی"

(لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص۲۴۶ گب)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہ پڑا تھا، اس میں امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی، فارسی، ہندی میں علٰحدہ علٰحدہ بھی اور تینوں زبانوں کے مصرعے یا لفظوں کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھوں نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں اس پر فخر کیا ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لئے ہیں:۔ سندھی[1]، لاہوری[2]، کشمیری[3]، بنگالی[4] لوڑی، لور بنگالہ کا ایک حصہ)، گجراتی[5]، تلنگی[6]، معربی[7] کرناٹکی[8] (جس کو کنڑی کہتے ہیں) دھور سمندری[9] (دھور سمندر کارو منڈل کا پایہ تخت تھا جو اس زمانے میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی[10] اور دہلوی[11]۔

یہی زبانیں تھوڑے تھوڑے فرق سے اب بھی موجود ہیں۔ امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابو الفضل ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

دہلوی[1]، بنگالی[2]، ملتانی[3]، مارواڑی[4]، گجراتی[5]، تلنگی[6]، مرہٹی[7]، کرناٹکی[8]، سندھی[9]، افغانی[10]، شالی[11] (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے)، بلوچستانی[12]، اور کشمیری[13]۔

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر زمانے میں صوبے وار بولیاں بولی جاتی تھیں اور اس میں کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی، اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی، ملک میں زبانوں کے اختلاف کا یہی حال رہا کہ ایک صوبے کا رہنے والا، دوسرے صوبے کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ملک جس میں کم از کم تیرہ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں اس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیوں کر قرار دیا جا سکتا تھا، اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لئے ایک متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی۔ یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا، اور اس کو ترقی دی۔

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی، جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکھنی اور دہلوی ہیں۔ جن صوبوں کی بولیوں کو الگ وجود نہیں بخشا گیا، ان میں بھی یہ اب تک ماننا پڑتا ہے

کہ ان کی دو قسمیں ہیں، ایک مسلمانی بولی سے الگ ہے۔ مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی خالص بنگالی، خالص مرہٹی، اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے۔ یہ امتیاز یوں ہے کہ مسلمان ان صوبہ وار بولیوں میں عربی، فارسی لفظوں کو ملا کر بولتے ہیں۔

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا، سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاوار تک ہوا ہوگا۔ اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔ سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھ والوں نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا،

"برکت شیخ تھا، اک موا، اک تہا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا) مرگیا اور دوسرا (فیروز شاہ تغلق) ناکام رہا۔

عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانے (۷۶۲ھ) میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہیں پیدا ہو چکا تھا۔ ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس طرح اس زبان کو وجود بخشا تھا۔ اس

زبان کی پیدایش کی اور پیدایش کی نہ سہی تو اس کے قیام، بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے، مسلمان جب اس پورے ملک پر حکم راں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ ناخواندہ اور عوام کے لئے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی، جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت، اور کاروبار میں کار آمد ہو، اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے۔

اُردو نام زبان اردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے جو بیان سنایا تھا، وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گزار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے اور آج سے پانچ سو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہیں اور تیموری بادشاہوں سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں، اور اب چہار درویش کے مصنف میر امن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، ان ہی

کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا نام چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا .... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم کے افراد قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہ جہاں صاحب قران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کرائی .... تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا، اگرچہ دلی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلی خطاب دیا۔"

ان چند سطروں میں اردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے، وہ زمانہ اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سر تا پا حقیقت ہے یعنی یہ کہ موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے، آج کل بعض فاضلوں نے 'پنجاب میں اردو' اور بعض اہل دکن

نے " دکن میں اردو" اور بعض عزیزوں نے " گجرات میں اردو " کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمدو رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام "اردو" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہیے، جیساکہ اس کے عہد کے لوگوں نے کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوئے۔

امیر خسرو اور ابوالفضل دونوں نے " دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہ جہانی میں جب یہاں اردوئے معلیٰ بنا، تو اس " زبان دہلی" کا نام " زبان اردوے معلیٰ" پڑگیا، چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی میں دہلی کے علاوہ کسی صوبے کی زبان پر اطلاق نہیں پایا ہے، میر تقی میر کی تحریری سند میں جب اس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے تو اصطلاح کے طور پر نہیں، بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے " اردو زبان" نہیں کہا، بلکہ " اردو کی زبان" کہا ہے۔

" ریختہ۔ شعرے است بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلیٰ بادشاہ ہندوستان" ذکر میر ص۹۲ بادشاہ ہندوستان کے کیمپ یا پایۂ تخت کی زبان۔

اس کے بعد عام استعمال میں زبان اردو کے بجائے خود زبان کا نام اردو پڑگیا اور پھر یہ اردوئے معلیٰ سے نکل کر ملک میں ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی، جس اصول پر ہندوستان میں ہمیشہ

راج دھانی کی بھاکا تمام حدود سلطنت میں پھیلتی رہتی ہے۔

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطروں میں اس کو بار بار "نئی زبان" کہا ہے، مگر کیا حقیقت میں اس کو نئی زبان کہنا چاہیئے؟ ہم جس کو آج زبان اردوئے معلیٰ کہتے ہیں حقیقت میں وہ دہلی اور اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے جو وہاں پہلے سے بولی جارہی تھی، اور جس میں زمانے کے قاعدے کے مطابق انقلاب، اُتار چڑھاؤ اور خراد ہو ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔

ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم، فعل اور حرف، اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں، فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں، حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں، البتہ اسم میں آدھے ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہیں، اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہیں، جن کے مسمیٰ ان باہر کے ملکوں سے ہیں، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی) پادری الماری وغیرہ۔

اس لئے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) میں صرف دو فرق ہیں، دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہ گئی، لیکن اسی ہندی میں اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ آ کر ملے، جن کے معنی اور مسمیٰ ان ملکوں سے آئے تھے، دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط میں اور یہ اردو فارسی خط میں لکھی جانے لگی۔

رفتہ رفتہ ایک اور بھی فرق پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان میں ہلکا پن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اسی طرح ع.بی اور فارسی اور ترکی کے لفظوں میں بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیاں پیدا کیں۔

اردو نے ہندی کے لفظوں میں اس قسم کا جو تغیر کیا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گنڑ	گن	جیو	جی
براہمنڑ	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
ووا	بیاہ	پونچا	پہنچا
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیوں کہ
ورش	برس (سال)	مالی	ماں
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سماں
اوچت	اچھا	دلیش	دلیں
سمبندھی	سمدھی	لکھشن	لچھن
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
ویچار	بچار	اگنی	آگ

ہندی	اردو	ہندی	اردو
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلا مانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا ساچ	سچ
ورشارت	برسات	کٹمب	کٹم (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانیں	پانی
بادر	بادل	دوہے	دہی
دُوھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھن بھن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس لئے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رل مل گئے، خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔

کہیں یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی،

بھائی برادر، رشتہ ناتا، داغ دھبّا، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم۔ کبھی فارسی لفظ میں ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے ہیں، جیسے جن، مجور، یا مزدور یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)۔

ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہیے کہ ان دونوں کے لکھنے والے اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالیں جن کو دونوں نباہ لے جائیں۔

رومۃ الکبریٰ

(قاضی عبدالغفار)

وادی سمپلن کی سرنگ سے (جو دنیا کی سب سے بڑی سرنگ کہی جاتی ہے) ہماری ٹرین ایک گھنٹہ میں گزری اور اب ہم اٹلی کے سرحد کے اندر داخل ہو گئے۔ اطالوی تہذیب کا پہلا نمونہ اسٹیشن پر دیکھا جہاں ہم گاڑی بدلنے کے لئے دو گھنٹے ٹھہرے تھے۔ کھانا کھانے کے لئے اسٹیشن کے ہوٹل میں گئے۔ اطالوی سوسائٹی کا وہ پہلا منظر ہمیشہ یاد رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نقش اول زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتا مگر بعض طبائع نقش اول سے بہت کچھ استنباط کر لیتی ہیں۔

اس شب کو میلان اسٹیشن کے ہوٹل میں میں نے سیکڑوں اطالوی مردوں اور عورتوں کو کھانا کھاتے دیکھا۔ اس منظر کی بدتمیزی اور گندگی بیان سے باہر ہے۔ ہمارے پاس ہی لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور اس طرح گوشت کے ٹکڑوں کو دانتوں میں لے کر چیرتے اور ہڈیوں کو چباتے تھے کہ بے اختیار یورپ کا عہد وسطےٰ یاد آتا تھا۔ ایک چیز ہمارے ہندوستان کی سوئیں کی صورت کی مگر نمکین اور ہندوستان کی

موٹی سے موٹی سوئیں سے بھی بیس گنی زیادہ موٹی رکابیوں میں بھر بھر کر لائی جاتی تھی اور وہ خدا کے بندے اس شوق سے اس کو کھاتے تھے کہ گویا ایک نعمت ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ macaroni اطالوی قوم کا قومی کھانا ہے اور ان کو بہت ہی مرغوب ہے۔ کچا آٹا، اس کی موٹی موٹی سوئیں بالکل مونج کی رسی کے ٹکڑے، ان میں نمک مرچ پڑا ہوا رکابی سے منہ تک لٹکتے ہوئے جاتے تھے اور پھر جبڑے بھی چلتے تھے۔ اور ان ٹکڑوں کا ایک حصہ منہ کے باہر بھی لٹکتا رہتا تھا، جیسے جانوروں کے منہ سے گھانس۔ چھری کانٹا میز پر ہوتا ہے مگر ان اشیا کا استعمال کچھ برائے نام ہے۔ سوائے اچھے ہوٹلوں کے جہاں ذرا صفائی کا زیادہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ زیادہ بھی اتنا کہ ہم ہاتھ سے کھانے والے لوگ پھر بھی اس کو گندگی اور بدتمیزی سمجھتے تھے۔ خدا کی پناہ! اس دن کس قدر مشکل سے چند لقمے کھائے۔ ہوٹل کی وہ غلاظت اور کھانے والوں کی وہ بدتمیزی وہ ہجوم۔ وہ شور۔ جبڑوں کے چلنے کی وہ آواز! معاذاللہ!

سنا تھا کہ اطالوی حسین ہوتے ہیں مگر ہم نے تو حسن کے آثار بھی کم دیکھے۔ البتہ یہ ضرور دیکھا کہ عورتیں فرانس کی وضع قطع کا منہ چڑاتی ہیں! اور ہر جگہ تھیٹروں اور بازاروں میں اس کی کوشش و خواہش نظر آتی ہے کہ پیرس کی نقل اڑائی جائے۔

ہم میلان سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر صبح کو روما پہنچے۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد طبیعت کو بدمزہ کرنے والا پہلا واقعہ تو یہ پیش آیا کہ ہمارا جو سامان بعد کو اسٹیشن سے لایا گیا، اس کو چنگی کے اہل کاروں نے اس بری طرح کھولا اور دیکھا تھا کہ بعض چیزیں ٹوٹ گئیں۔ بعض کپڑے خراب ہو گئے اور پھر گو دڑ کی طرح بکسوں میں بھر دئے گئے۔

تیسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ہوٹل کے ملازمین (حالاں کہ وہ ہوٹل ایک اچھا ہوٹل سمجھا جاتا ہے) تقریباً سب کے سب مسافروں کی ناواقفیت سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ جس کسی کی جیب میں ہاتھ پڑ سکے کچھ حاصل کریں۔ بعد کے تجربوں نے بتایا کہ اہل اطالیہ (خصوصاً شہری آبادی) عام طور پر بہت طامع اور خود غرض ہوتے ہیں۔

اب صرف دو چیزیں بیان کروں گا۔ اول روما کے آثار قدیمہ جن کو اچھی طرح دیکھا اور عبرت کی نظر سے دیکھا، دوسرے ترک احباب کی ملاقاتیں۔

روما کی پرانی دیواروں اور شکستہ عمارتوں پر گویا ہزاروں برس کی تاریخ کندہ ہے۔ اہل نظر ان آثار قدیمہ میں جس سے سارا شہر بھرا پڑا ہے۔ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ روما کی تاریخ درحقیقت دنیا کی تاریخ ہے۔ میں جو کچھ کتابوں میں پڑھ چکا تھا سب ان آثار کو دیکھ کر تازہ ہو گیا۔ ان مقامات کے دیکھنے میں مجھے ایک عجیب لطف آتا تھا۔ جو تاریخی واقعات کتابوں

میں پڑھے تھے وہ گویا نظر کے سامنے تھے۔ سیزر کہاں قتل کیا گیا تھا۔ انٹونیس نے کس جگہ کھڑے ہو کر تقریر کی تھی۔ نیرو نے کن عمارتوں کو جلا کر راکھ کیا تھا۔ سینٹ پیٹرس کہاں مارے گئے تھے اور کیوں کر دفن ہوئے تھے۔ کلیڈیبس جس نے قوم گوتھ کے تین لاکھ نفوس کو تہ تیغ کیا تھا (اس عہد جدید کی خون آشامیوں کے مقابلہ میں وہ قتل عام ایک کھیل ہوگا) کس جگہ دربار کرتا تھا۔ وہ پل کس موقع پر تھا جس پر ہوریشیس نے پورسینا کی فوجوں کو روکا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پورے ڈھائی ہزار برس کی تاریخ پیش نظر تھی اور خدا یاد آتا تھا۔

روما کی تاریخ قدیم کے راز اس کی اینٹوں میں پنہاں ہیں۔ کوئی پتھر نہیں جس پر خون کے دھبے نہ پڑے ہوں۔ ہر گھر کسی نہ کسی دردناک واقعہ کی یادگار ہے۔ ہر پرانا درخت ایک گواہ ہے جس نے بہت سے خوف ناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ ہر پھول جو اس سرزمین پر اگا ہوا ہے اس نے مٹی میں جذب ہو جانے والے خون سے زندگی پائی ہو گی اور وہ جب کھلتا ہے۔ تو گویا کسی نہ کسی قبر پر کھلتا ہے۔

رومتہ الکبریٰ کے بانی دو جنگلی انسان بتائے جاتے ہیں۔ جن کو ایک بھیڑے نے پرورش کیا تھا۔ شہر کے خاص خاص مقامات پر ایک تصویر اکثر نظر آتی ہے جس میں دو انسان کے بچے ایک بھیڑیے کی مادہ کا دودھ پیتے نظر آتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے بچوں کے متعلق اس قسم کی حکایتیں

کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ فردوسی نے رستم کے بیٹے کو کوہ البرز کی چوٹی پر عقاب کے گھونسلے میں پرورش کرایا۔ بے نوا کی سلطنت کے بانی کو اس کے بچپن میں فاختہ دانہ کھلاتی تھی۔ خود ہندوستان میں اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ وسط ہند کے گونڈوں کی زندگی بھی شیر کی حکایتوں سے وابستہ ہے۔ غرض یہ کوئی نیا توہم نہیں ہے۔ مگر اٹلی میں تو رومیلس اور ریمس اور بھیڑیئے کی مادہ (جوان کو دودھ پلاتی تھی) قومی تاریخ کا ایک جزو ہو گئے ہیں۔ اور ان کی تصویر ایک قسم کا قومی نشان سمجھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دو مشہور عمارتوں کے دروازوں پر کٹہروں میں زندہ بھیڑیئے بند ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اطالوی قوم کی "گرگ زادگی" (اگر اس اصطلاح کا استعمال کرنا بے جا نہ ہو) کا قومی نشان ہیں اور درحقیقت اہل روما "گرگ زادہ" یا "پروردۂ آغوش گرگ" ہیں یا نہیں، خدا کو معلوم ہے۔ مگر جن لوگوں نے جنگ طرابلس کے حالات پڑھے ہیں وہ تو ایک حد تک ان کی زندگی سے انکار نہیں کر سکتے۔

یورپ میں کہتے ہیں کہ اگر انسان کے کیریکٹر و اخلاق کا اندازہ کرنا ہو تو آدمی کو اس وقت دیکھئے جب وہ کھانا کھانے بیٹھے۔ اس لئے اطالوی مرد اور عورتوں کو گوشت اور تقریباً کچے گوشت کے ٹکڑے دانتوں سے چیرتے پھاڑتے دیکھا ہے۔ بہرحال رومیلس اور ریمس کی اولاد بھیڑیئے کی خصوصیات سے دو ہزار برس بعد بھی محروم نہیں ہوئی ہے۔ گو اب ان کے جسم کے لمبے

بال باقی نہیں اور صدیوں تک انسانی تہذیب و تمدن کے سایہ میں پرورش پاکر اب ایک اچھا طمع ہوگیا ہے۔ تاہم وہ کچھ نہ کچھ اپنی دایہ کی روایات کو روشن رکھتے ہیں۔ رومتہ الکبریٰ کی سات پہاڑیوں پر آج جو آبادی پھیلی ہوئی ہے اس کا رشتہ عہد ماضی کی بہیمیت سے منقطع ہوا ہو مگر بالکل منقطع نہیں ہوا۔ کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

رومتہ الکبریٰ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

چند چرواہوں نے کسی پہاڑی پر اپنا گاؤں آباد کیا اور قضا و قدر نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈال دی جس کے تاجداروں نے صدیوں تک دنیا میں نور و ظلمت کے ہنگامے برپا رکھے جس طرح آدم کی عمر میں پہلی دفعہ عورت نے انقلاب پیدا کیا تھا جس کے تلخ ثمرات آج ہم کو کھانے پڑ رہے ہیں، اسی طرح روما کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عورت نے انقلاب عظیم پیدا کیا۔ یہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک حسین عورت کا حسن ولی عہد سلطنت کو بے اختیار کر دیتا ہے اور وہ نوجوان رات کو برہنہ تلوار لے کر اس عورت کے سرہانے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس سلطنت کا ولی عہد ہوں۔ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ تیری عصمت آج کی شب میری تلوار پر قربان ہونی چاہئے۔ اس عورت کا غرور نسوانیت چمکتے ہوئے فولاد سے مرعوب نہیں ہوتا۔ مگر وہ شاہزادے کی بہیمانہ طاقت سے ناچار مغلوب ہوتی ہے اور صبح کو اپنے شوہر اور باپ کے سامنے اپنی رسوائی کا حال سنا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کی لاش سامنے پڑی ہے اور بروٹس اسی چھری کو اٹھا کر

جس سے ابھی ابھی اس عورت نے اپنا کام تمام کیا ہے قسم کھاتا ہے اور کہتا ہے ''اس معصوم خون کی قسم جو اس چھری سے ٹپک رہا ہے، دیوتا میرے گواہ ہیں۔ میں مغرور تارکوین سے انتقام لوں گا۔ اس سے اور اس کے اہل وعیال سے یہ چھری انتقام لے گی اور اس چھری کی قسم اور اس خون کی قسم آیندہ وہ مغرور اور اس کی اولاد میں سے کوئی اس ملک پر حکومت نہ کر سکے''

وہ لاش سر بازار رکھی ہوئی ہے اور ہزاروں انسان آتے ہیں اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کا حلف اٹھاتے ہیں۔ اس طرح ایک خونیں عہد کا آغاز ہوتا ہے اور آخر حکم راں خاندان کا ایک بچہ بھی ملک میں باقی نہیں رہتا اور اہل ملک اپنی ایک جمہوریہ قایم کرتے ہیں۔ یہ دو ہزار برس کا واقعہ ہے۔ لیکن آج بھی اس عورت کا نام تاریخوں میں روشن ہے جس کے خون نے ایک حکم راں خاندان شاہی کی بنیادیں ہلادیں۔ اس واقعہ کو داستان کہن کیوں کہئے۔ انسانوں کے دلوں میں مظلومیت اور انصاف کے جذبات کو بلکہ تمام جذبات عالیہ عورت ہی ہمیشہ پیدا کرتی ہے۔ وہ قوم کہاں ہے جس کی قومیت عورت کے انقلاب انگیز وجود کی مرہون منت نہ ہو۔ جب روما کی سر زمین پر دولت کے کرشمے نظر آنے لگے اور حکومت وطاقت کا دائرہ وسیع ہو چلا، انسان انسان کو غلام بنانے لگے اور غلامی کا وہ ہیبت ناک عہد شروع ہو گیا جب لاکھوں انسان کتوں سے بد تر حالت میں

مبتلا ہو گئے۔ یہ وہ عہد تھا جس کے اثرات نے تمام یورپ کو
بد ترین بہیمیت میں مبتلا کر دیا۔ اور جو اینٹ کی ان شرم ناک
خود پرستیوں میں تمام براعظم کو گندہ کر دیا۔ جس کی ایک ادنیٰ
مثال اندلس کی مذہبی عدالتیں تھیں۔ اگر عرب میں اسلام کی روشنی
نمودار نہ ہو گئی ہوتی تو شاید آج ساری دنیا اس غلامی کی
زنجیروں میں گرفتار ہوتی یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت روما کی فتوحات
کا سلسلہ یونان تک پہنچ چکا تھا اور مفتوحہ ممالک سے ہزار ہا
غلام پابہ زنجیر آتے تھے اور بازاروں میں ترکاریوں کی طرح
فروخت ہوتے تھے۔ اہل روما یونان کی عظمت اور اس کے
علم و فضل اور اس کی صناعیوں کو دیکھ کر حسد کرتے تھے۔ وہ
دماغ ان کو نہیں ملا تھا، جس نے اہل یونان کو دنیا کا استاد بنایا
لیکن روما کو یونانیوں کی علمی عظمت کا بہتر نمونہ بنانے کی خواہش
رومیوں کو ملک گیری پر آمادہ کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یونان کے
بہترین خزانے صنعت و علم کے بہترین ذخائر جو وہاں جمع تھے
روما کی فاتح فوجوں کے ذریعہ سے اطالیہ میں لائے گئے۔ اور
آج تک موجود ہیں۔ صرف ایک فاتح مرکس فلوبیس اپنے صرف
ایک حملہ کے بعد تاریخ ہم کو بتاتی ہے، کہ سیکڑوں من سونا، کروڑوں
طلائی سکّے، ۲۸۵ فولادی مجسمے (قد آدم) ۲۳۰ سنگ مرمر کے
مجسمے، تصویریں اور صناعی کے بہترین نمونے روما میں لایا۔
اس طرح وہ خزانے جمع ہوئے جن کا ایک عکس پاپائے روم کے عجائب خانہ
میں سیّاح کو نظر آتا ہے۔ اطالوی قوم کے اندر جو ہر اصلی نہ جب

تھا نہ اب ہے۔ مگر انھوں نے یونان کی نقل شروع کی اور خوب کی۔ اطالیہ کی تاریخ کا مطالعہ مجھے اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ بلحاظ شعور اور دماغ یہ قوم کبھی کوئی بلند پایہ نہ رکھتی تھی۔ البتہ اس نے کسی حد تک یونان کے کمالات کی نقل اُتاری اور اسی سلسلہ میں دو چار ایسے صناع اور مصور بھی پیدا کیے جو اپنی مخصوص دماغی قابلیت پر ناز کرنے کا حق رکھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی اور ازروئے انصاف سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ روما میں سپاہی تو تھے مگر اہل علم کبھی نہ تھے۔ تلوار تھی قلم نہ تھا اور ایک قومی خصوصیت اور بھی تھی، وہ معمار تھے اور عمارتوں سے اپنی قومی عظمت بتلاتے تھے۔ ان کی نظر میں عظمت کا معیار ہر چیز کی جسامت تھا یعنی عمارتوں میں خوبصورتی ہو یا نہ ہو مگر ان کی بلندی، ان کا جسم، ان کے محرابوں کی وسعت، ان کا استحکام، یہ چیزیں تھیں جو قومی فخر و نخوت کی مظہر تھیں۔

ایک فلسفی جب اس کلیہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ تہذیب و تمدن اور معاشرت اور ان سب کی دایہ دولت جس قدر زیادہ بڑھتی ہے، اسی قدر حیوانیت اور بد اخلاقی بھی ترقی پاتی ہے، تو بظاہر یہ دو چیزیں کس قدر متضاد نظر آتی ہیں۔ مگر فلسفی کے اس کلیہ کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی واقعات کا ایک لا منتہائی سلسلہ پیش نظر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی اعلی یورپین تہذیب نے انتہائی بہیمیت کے جو مناظر دنیا کے سامنے پیش کیے وہ کوئی نئی چیز

نہیں۔ دنیا میں اکثر یہی ہوتا رہا ہے۔ انسان کا تمدن جب زیادہ اعلیٰ اور اس کی معاشرت زیادہ پُر تکلف اور اس کے علوم و فنون زیادہ وسیع ہوتے ہیں تو نفس لئیم بھی زیادہ طاقت ور ہوجاتا ہے۔ سلطنت روما کی عظمت کا وہ زمانہ جب دنیا کی نظریں رومۃ الکبریٰ کے دروازوں پر لگی رہتی ہیں اور مسیحیت کا اُسقف اعظم عیسائی دنیا میں دیوتا سمجھا جاتا ہے، دنیا کے خزانے روما کی سڑکوں پر پڑے ہوئے ہیں اور تاج داروں کے سروں کو ادنیٰ ادنیٰ سپاہی ٹھکرا دیتے ہیں، وہ زمانہ طاقت، دولت اور تمدن کا بہترین زمانہ کہا جاتا ہے لیکن عین اسی زمانہ میں بہیمیت اور خوں خواری کی بدترین مثالیں موجود ہیں! انیرو کی خوں آشامیاں ان خوں ریزیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں جو مسیحیت کے مرکز پر اس عہد میں رونما ہوئیں۔ جب روما اور اس کے اساقف کی بلنداقبالی دنیا میں اپنے ڈنکے بجا رہی تھی، دارالسلطنت کی وہ تباہی کچھ بھی نہ تھی جو عہد اول کے تاج داروں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس آتش زدگی اور خوں ریزی کے مقابلہ میں جس کا دورِتہذیب و تمدن میں روما شکار ہوتا تھا، سولھویں اور سترھویں صدی کی رومن تاریخ اور اب بیسویں صدی کے تمدن کا باہم تقابل اہل نظر کے لیے کچھ ایسا مشکل نہیں۔

مسیح کے جانشیں جو مسند حکومت پر ہینبال اور نیرو سے کچھ کم نہ تھے، اپنی روحانی چادروں کو لاکھوں انسانوں کے

خون سے رنگتے تھے اور ان کی عبائے تقدّس پر ہوس، عیش پرستی اور دنیا طلبی کے ایسے دھبّے لگتے تھے جو آج تک عیسائی مورخین کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ قوموں کی اقبال مندی کی وہ ایک عبرت انگیز مثال ہے کہ مسیحیت کا اسقف اعظم کبھی شمشیر برہنہ لے کر میدان جنگ میں مسیحی روحانیت کی داد دیتا ہے اور کبھی روما کی گلیوں میں منہ چھپائے بھاگا چلا جاتا ہے۔ ایک دو نہیں مسیح کے کم و بیش بیس تیس مسند نشینوں نے اپنی زندگی کا سفر تلوار کی دھار پر ختم کیا۔

۸۹۶ء سے ۱۸۵۹ء تک پاپائے روما کی رعایا نے جانشین مسیح کے خلاف ۱۶۱ دفعہ بغاوت کی اور دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کے دریا بہے۔

یورپ کے عہد وسطیٰ کی مسیحیت یہ تھی! جس کی یادگار آج ایک بوڑھے میاں اپنے گزشتہ اقبال کا داغ کلیجے سے لگائے ہوئے وٹیکن (پاپائے روما کا محل) میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی امن اور صلح کے چند کاغذی پیام دنیا کو بھیج دیتے ہیں، جو ایسے پیاموں کو تلوار کی نوک پر مارتی ہے۔

لے رومن کیتھولک عقاید کا معتقد اکارڈنل بیرونیس کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ "بہت سے ایسے لوگ پاپائے روما کے تخت پر بیٹھ چکے ہیں جنھیں ہم دیو اور شیطان کے نام سے بھی یاد نہیں کر سکتے۔ ان کی حرکات دیووں اور شیطانوں سے بھی کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں"

یہ تھا روما جس کو ہم دیکھنے گئے تھے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کتابوں کے اوراق پر اپنی ساری عمر نثار کر دیتے ہیں، لیکن وہی تاریخ تمام وکمال کسی ایک لوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں یا کسی ایک شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ کر نظر کے سامنے گزر جاتی ہے۔ میں نے روم کی تاریخ جو کچھ پڑھی وہ کچھ بھی نہ تھی، اس کے مقابلہ میں جو اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

مقدمہ دریائے لطافت

(مولانا عبدالحق)

سید انشاء اللہ خاں کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی خداداد ذہانت طباعی، شوخی و ظرافت اور جدت کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ان کی خاندانی شرافت اور اخلاق و آداب دلی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے۔ ان کے بزرگ دلی میں آکر بس گئے اور وہیں کے ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ شاہی دربار میں رسائی ہوئی اور سلسلہ امرا میں داخل ہوئے۔ سید انشا اللہ خاں بھی شاہ عالم بادشاہ کے درباریوں میں تھے۔ لیکن شاہ عالم کی بادشاہت نام کی رہ گئی تھی۔ اگرچہ بادشاہ نیک دل تھے اور اپنے خانہ زادوں اور خاندانی متوسلین کی ہر طرح خاطر کرتے تھے لیکن وہ خود مجبور تھے کمپنی بہادر کے پنشن خوار اور نام کے بادشاہ، وہ قدر دانیاں اور قدر افزائیاں کہاں کر سکتے تھے جن کی وجہ سے ان کے بزرگوں کے نام اب تک دنیا میں روشن ہیں۔ دلی اب وہ دلی نہ رہی تھی۔ ظاہری آداب باقی رہ گئے تھے۔ مگر سلطنت کی جڑ کبھی کی کھوکھلی ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی دولت و ثروت اور علم و فضل بھی رخصت ہو رہے تھے۔ وہ اہل کمال جن کا دار و مدار بادشاہوں کی قدر دانی پر ہے، ان کا ٹھکانا اب یہاں نہ رہا تھا۔ دلی کے زوال پر سلطنت کا ٹھاٹھ لکھنؤ میں جما۔

آصف الدولہ کی سخاوت اور فیاضی نے حاتم کے نام کو بھلا دیا تھا۔ اہل کمال جو قدردانی کے بھوکے تھے، ایک ایک کرکے وہاں پہنچے۔ یہاں تک کہ میر تقی جیسے شخص نے بھی جن کی غیرت اور استغنا کی قسم کھانی چاہیے، اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ غرض سید انشاء اللہ کو بھی یہی کشش لکھنؤ لے گئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد دربار تک رسائی ہوئی اور وہاں پہونچتے ہی اپنی لطیفہ گوئی طباعی اور شاعری کی بدولت وہ عروج ہوا کہ نواب سعادت علی کی ناک کے بال ہو گئے۔ نواب سعادت علی خاں اگرچہ بہت بے دار مغز اور منتظم شخص تھے مگر آخر فرصت کے وقت انھیں بھی دل لگی اور تفنن طبع کے لئے کچھ ملنا چاہیے تھا، اس کے لئے سید انشاء اللہ سے بڑھ کر اور کون مل سکتا تھا انھوں نے نواب کو ایسا رجھایا کہ ان کے بغیر ایک دم چین نہ آتا تھا۔ امرا کی صحبت آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی، اور باوجود غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے سید صاحب کا یہی حشر ہوا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں بے تاب کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔" اس قول کے پہلے حصہ سے تو مجھے بالکل اتفاق نہیں البتہ دوسرا حصہ بالکل صحیح ہے۔ شاعری خود ایک بڑا کمال ہے اور ایسا بڑا کمال ہے کہ اگر کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے دوسرے کسب و کمال ہیچ ہیں۔ البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ سید انشاء

کی طبعی ظرافت اور شوخی کو درباری مصاحبت اور مذاق نے خراب کیا اور اس نے ان کی شاعری کو بھی بگاڑے بغیر نہ چھوڑا۔ شوخی اور ظرافت بڑی پُر لطف چیز ہے اور کلام کا رتبہ اس سے بعض اوقات بہت بلند ہو جاتا ہے اور دلوں کے شگفتہ کرنے اور بعض خیالات کے ادا کرنے میں یہ ایک سحر کا کام کرتی ہے بشرطیکہ ایک حد تک اور مناسبت سے ہو اور کوئی لطافت بھی پائی جاتی ہو (جیسے مرزا غالب کے کلام میں) لیکن افسوس ہے کہ سید انشاء اللہ کے کلام میں بعض اوقات یہ شوخی وظرافت تمسخر اور پھکڑ کے درجہ تک اور پھکڑ سے فحش اور شہدپن تک پہنچ گئی ہے جو کانوں کو ناگوار اور ذوقِ سلیم پر بہت گراں گزرتا ہے۔

سید انشا کا کلام

ان کا کلیات جو طبع ہو گیا ہے اس میں کلام ذیل شامل ہے:- (۱) اردو کا دیوان (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد (جس میں ایک قصیدہ منقبت بے نقط و اشعار ترکی وغیرہ بھی شریک ہیں (۴) دیوان فارسی (۵) مثنوی شیر و برنج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (لوح سرخی بھی بے نقط و موزوں) (۷) مثنوی شکار نامہ (۸) مثنویات در ہجو زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس (۹) مثنوی شکایت زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار (۱۲) اشعار متفرقہ و رباعیات و قطعات تاریخ ہائے متفرقہ (۱۳) چیستانیں اور پہیلیاں مخمس وغیرہ (۱۴) دیوان اردو بے نقط مع رباعیات و نثر بے نقط (۱۵) شرح مائۃ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغ نامہ۔

اس کے علاوہ ایک داستان اردو نثر کی لکھی ہے جس میں یہ

اہتمام کیا ہے کہ کوئی لفظ عربی فارسی کا نہ آنے پائے اور باوجود اس کے کلام اردو کے پائے سے گرنے نہ پایا۔ یہ درحقیقت بڑے کمال کی بات ہے۔ آج اگر کوئی چاہے ایک صفحہ بھی اس عبارت کے ساتھ لکھ لے تو ممکن نہیں۔

لیکن سید انشا کی سب سے بڑی یادگار اور قابلِ قدر تصنیف "دریائے لطافت" ہے۔ اس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا حصہ یعنی اردو صرف و نحو تو سید انشا اللہ کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ یعنی منطق عروض و قافیہ و معانی و بیان مرزا محمد احسن قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے۔ کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روز مرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

سید انشا اللہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے

قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔ علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور ان کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا، ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنھیں زبان کا ذوق ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی بڑی سلاست اور جامعیت سے بیان کیے گئے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اس بارے میں جن جن باتوں کا انھوں نے خیال کیا ہے متاخرین کو بھی وہ نہیں سوجھیں، حالاں کہ ایسا عمدہ نمونہ موجود تھا۔ اس سے سید انشاء اللہ خاں کے دماغ اور ذوق زبان کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی فصاحت وغیر فصاحت صحت وغیر صحت کے متعلق کتنی سچی رائے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے، کیوں کہ جو کچھ خلاف اردو ہے، غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔" اس اصول کو قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سید انشا کی رائے میں برقا صحیح اردو کا لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے۔

یادہ غدر کو بفتح "د" اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ اصل میں سکون دال ہے۔ یہ سن کر بعض اصحاب جنھیں صحت لغت کا اسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومن متقی کو ادائے ارکان صلوٰۃ کا اور خصوصاً ثقات لکھنؤ بہت جز بز ہوں گے لیکن جو لوگ اصول لسان سے واقف ہیں وہ سید انشا کی وسعت نظر اور اصابت رائے کی داد دیں گے۔ فرق یہ ہے کہ سید انشا اردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھا کر یا گھس پس کر یا اختلاف لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے، وہ اب اردو کے لفظ ہو گئے ہیں، انھیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا اور جو کچھ صورت ان کی پیدا ہو گئی ہے اور جس طرح وہ زباں زد خاص و عام ہو گئے ہیں، وہی ان کی صحیح صورت ہے اصل زبان سے خواہ وہ کیسی ہی متبائن اور مختلف کیوں نہ ہوں مگر جو حضرات ابھی تک ان عربی فارسی الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں اصلی صورت میں لکھنا اور بولنا صحیح اور فصیح سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف غلط اور غیر فصیح تو گویا وہ ابھی اردو زبان کو زبان ہی نہیں سمجھتے۔ اسی اصول کو اگر مدنظر رکھا جائے اور ہر اردو لفظ اس کی اصلی صورت میں (یعنی جس زبان سے وہ آیا ہے) لکھنا اور بولنا شروع کریں تو اردو زبان کوئی زبان ہی نہ رہے گی اور موجودہ تحریر و تقریر کے الفاظ باستثنائے چند کے غلط ٹھہریں گے کیوں کہ اس میں جس قدر الفاظ ہیں وہ یا تو سنسکرت اور ہندی زبانوں کے ہیں یا عربی فارسی ترکی یا بعض یوربی السنہ کے۔

اردو زبان مستقل زبان اسی وقت ہو گی جب وہ ان زبانوں سے لفظ لے کر انھیں اپنا کر لے اور جہاں وہ اپنے ہوئے ان کی شکل و صورت وضع و قطع، رنگ ڈھنگ میں ضرور فرق آ جائے گا۔ مگر ہم میں سے بعض نازک دماغ دقیق نظر حضرات کو ان غیر ملکیوں کی یہ بے تکلفی ہر گز نہیں بھاتی۔ وہ انھیں اپنا بنانا نہیں چاہتے بلکہ انھیں ڈھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر سید انشا کے اصول پر عمل ہوتا رہتا تو اب تک اردو میں بہت کچھ وسعت لطف اور شیرینی پیدا ہو جاتی۔

اس کتاب کے پہلے ہی باب میں سب سے اول انھوں نے اردو کے حروف ابجد سے بحث کی ہے اور ان کی تعداد کے تعیّن میں بڑی بڑی جدت طرازیاں کی ہیں۔ سید انشا کے بعد سے اردو صرف و نحو اور لغت وغیرہ پر بیسوں ہی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جس جس پہلو سے انھوں نے ان حروف تہجی کو دیکھا ہے اور ان کے اقسام قائم کیے ہیں بہت کم لوگوں کی نظر وہاں تک پہنچی ہے حالاں کہ دیکھنے میں یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ معمولی تقسیم حروف کے جو ہر معمولی کتاب میں پائی جاتی ہے، مثلاً عربی کے اتنے فارسی کے اتنے اور ہندی کے اتنے، سید صاحب ایک قدم اور بڑھے ہیں۔ اس تقسیم کے بعد انھوں نے ان حروف کو لیا ہے جو کسی خاص حروف سے مل کر ایک آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً سترہ حروف ایسے ہیں جو ہ کے ساتھ مل کر ایک آواز دیتے ہیں، جیسے بھاگنا۔ پھندنا

وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ہاں اب کہیں اردو قاعدوں میں یہ حروف بڑھائے گئے ہیں حالاں کہ سید انشا مدتوں پہلے لکھ چکے ہیں۔

یا سترہ حروف ایسے ہیں جو نون کے ساتھ مل کر ایک آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً پنڈول۔ رنگیلا۔ ہنسنا وغیرہ اردو قاعدوں میں اب تک ان حروف کا ذکر نہیں۔

اسی طرح بعض حروف ایسے ہیں جو تی کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتے ہیں مثلاً کیا (حرف استفہام)، دھیان، پیارا وغیرہ۔ غرض اسی طرح سید انشا نے اردو حروف تہجی کی کل تعداد پچاسی بتائی ہے۔

(دوسرے باب میں دہلی کے محلوں کے تمیز کے متعلق بڑی دل چسپ بحث کی ہے اور بہ تفصیل بتایا ہے کہ کس کس محلے کی زبان فصیح ہے اور کہاں کہاں کی غیر فصیح)۔ (اہل مغل پورہ) سادات بارہ، پنجابیوں، پوربیوں کی زبان کیسی ہے اور ان کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ اور لہجہ اور زبان میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے اور یہ سب امور تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور ایسے لطف کے ساتھ کہ جی خوش ہو جائے۔ اسی میں سید انشا اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں کا مشہور مکالمہ ہے۔ ہیں تو گنتی کے دو تین ہی جملے مگر آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے)۔

(تیسرے باب میں بعض فصحا وغیرہ کا ذکر ہے اور بعض ایسے الفاظ کا بیان کیا گیا ہے جو اردو نہیں یا متروک ہیں اور

میر تقی یا مرزا سودا نے ان کا استعمال کیا ہے۔ اسی باب میں نواب عماد الملک، بھاڑ امل، مرزا صدر الدین صفاہانی اور ملا عبدالفرقان کی دل چسپ تقریریں ہیں۔ خاص کر بی نورن اور میر عنفر غینی کی تقریریں نہایت دل چسپ ہیں۔ بی نورن اور میر عنفر غینی کی تقریریں ایسی پاک، صاف، شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشا کی زبان دانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں۔ بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتے اور اس میں شعرائے عصر کے کلام و حال پر جو تنقید کی ہے وہ بہت ہی ظریفانہ ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔

اسی باب کے آخر میں دہلی و لکھنؤ کی فصاحت و فوقیت کا پُر لطف موازنہ ہے اور دونوں طرف کے دلائل کو بیان کیا ہے۔ اس میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ چوں کہ سید انشا نواب سعادت علی خاں کے ملازم و مصاحب تھے، اس لیے کس کس طرح پہلو بچا بچا کر اس بحث کو بٹھایا ہے۔

(باب چہارم میں مصطلحات دہلی اور باب پنجم میں گفتگو و مصطلحات زنان دہلی کا ذکر ہے۔ یہ دونوں باب محققین زبان اور مؤلفین لغت کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہیں)

(اس کے بعد اردو صرف و نحو ہے۔ نہ صرف اردو صرف و نحو کی

یہ پہلی کتاب ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی اسے تقدّم اور فضیلت ہے کہ یہ اول کتاب ہے جس میں اردو کی صرف و نحو بہ لحاظ زبان بیان کی گئی ہے اور عربی فارسی کی اندھوں کی طرح تقلید نہیں کی گئی۔ اگر مابعد کے مؤلفین اس اصول کو پیش نظر رکھتے تو اس وقت تک اردو صرف و نحو مکمل ہو جاتی۔

اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ سید انشا اللہ خاں کا اردو زبان پر بہت بڑا احسان ہے اور خصوصاً یہ کتاب انھوں نے ایسی لکھی ہے کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے، اس کے مطالعہ اور اس سے استفادہ اور سند لینے کی ضرورت باقی رہے گی۔

داس کتاب کا دوسرا حصہ منطق و عروض و قوافی اور معانی و بیان میں ہے۔ یہ حصہ مرزا قتیل کا ہے اور زیادہ قابل لحاظ نہیں بلحاظ فن کے بھی زیادہ مستند خیال نہیں کیا جاتا۔ البتہ منطق و عروض میں ایک جدّت انھوں نے ضرور کی ہے یعنی اصطلاحات فن کا ترجمہ اُردو میں ہے۔ مثلاً۔

تصور	دھیان	بدیہی	پرگھٹ
تصدیق	جوں کا توں	نظری	گمبیت
موضوع	بول	تسلسل	الجھاسوت
محمول	پھوبور	دور	ہیر پھیر
رابط	جوڑ	مطابقت	ٹھیک ٹھیک
نسبت	لاگ	التزامی	اوپری لگاؤ
قضیہ	بات	مثلّث	تکڑا

مربع   چوکڑا وغیرہ

یہ امر قابل غور ہے کہ اصطلاحات علمی اس طور پر تراشی جائیں یا ترجمہ کی جائیں تو اس سے علوم کے ترجمہ کرنے یا عام طور پر علوم کے مقبول کرنے میں کہاں تک آسانی ہوتی۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ہمیں اصطلاحات کے وضع کرتے وقت جہاں تک ممکن ہو (بشرطیکہ رکاکت پیدا نہ ہو) ہندی سے ضرور مدد لینی چاہیے۔ مثلاً اگر تصفیۃ الاجنحہ کی بجائے ادھ پرا یا ادھ پنکھ یا عدیمۃ الاجنحہ کی بجائے بے پرا یا بے پنکھ یا عدیمۃ الذنب کی جگہ بے دُما وغیرہ کہا جائے تو کیا ہرج ہے۔ بلکہ اس سے سراسر فائدہ ہے۔ بعض الفاظ جو بوجہ سخت اور کرخت ہونے کے ہماری زبان پر نہیں چڑھتے ان کا ترک کرنا اولیٰ اور ان کی بجائے ہندی یا فارسی اصطلاحات کا استعمال کرنا مناسب ہے۔

مرزا قتیل نے بھی اس حصہ میں سید انشا کی پیروی کی ہے اور مزاح و تمسخر میں کوئی کمی نہیں کی مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوا ہنس کی چال چل رہا ہے۔ مرزا صاحب کا مزاح اکثر بے نمک ہے۔ انھوں نے عروض میں بجائے مروجہ الفاظ اوزان کے نئے الفاظ تراشے ہیں مثلاً بجائے مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کے بی جان پری خانم بی جان پری خانم اور بجائے فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کے چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم وغیرہ فرماتے ہیں۔ میں نے منطق اور عروض و قوافی کا بیان کتاب سے ترک کر دیا ہے کہ وہ کچھ مفید نہ تھا البتہ بیان و معانی کا بیان بطور

نمونہ کے رہنے دیا ہے۔ وہ کسی قدر ٹھیک ہے۔

اس کتاب کے طبع میں بڑی دقت تھی۔ اول تو یہ کہ جابجا فحش کلمات بے تکلف استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لئے ان کے خارج کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، کیوں کہ بعض اوقات مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ دوسرے سید انشا کی طبیعت میں اپج تو تھی ہی، انھوں نے حروف کے نام بھی نئے ایجاد کیے ہیں۔ غالباً اس میں انھوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت رکھی ہے۔ مثلاً الف کو اقبال، ب کو بخشش، پ کو پاکیِ طینت، ت کو ترحم، خ کو خدا ترسی، ژ کو ژرف نگاہی، ک کو کم دماغی، ہ کو ہمت بلند کہاہے اور اسی طرح دوسرے تمام حروف کو الگ الگ نام دیے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مثلاً کھن ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ اس کا تلفظ وہ اس طرح بتاتے ہیں "یا کم دماغی مفتوح یا ہمت بلندی کی گشتہ و نفاست ساکن بمعنی گاہے"۔ اور چوں کہ کتاب میں مختلف تقریریں اور مختلف بولیاں درج ہیں وہ ایک ایک لفظ کا تلفظ اس طریقہ سے بتاتے ہیں تو پڑھنے والے کو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے اس طریقہ کو بھی ترک کر دیا ہے اور مروجہ اور معمولی طریقہ اختیار کیا ہے۔ تاکہ ناظرین کو سہولت ہو۔

اس کتاب کی تصنیف میں چونکہ سید انشا اور مرزا قتیل دونوں شریک تھے۔ اس لئے نام بھی دونوں نے دو دو تجویز کیے ہیں۔ سید انشا نے اپنے آقائے ولی نعمت نواب ناظم الملک سعادت علی

خاں بہادر کے نام کی رعایت سے ارشادِ ناظمی اور بحر سعادت تجویز کیے۔ اور مرزا قتیل نے دریائے لطافت اور حقیقت اردو۔ مگر ان میں دریائے لطافت ہی مقبول ہوا اور وہی آج تک مشہور ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲۲ھ ہجری مطابق ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کے چھیالیس برس بعد مولوی مسیح الدین خاں بہادر کاکوروی نے اپنے مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد میں بہ تصحیح و اہتمام مولوی احمد علی گوپاموی طبع کرایا۔ مولوی مسیح الدین خاں مرحوم میر منشی گورنر جنرل و سفیر شاہ اودھ تھے اور بعد ازاں واجد علی شاہ مرحوم کی والدہ کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد مرشد آباد میں ایک فارسی ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور اس میں اچھی اچھی کتابیں طبع کرائیں۔ مولوی صاحب کی خوش مذاقی کی بدولت یہ کتاب دست بُردِ زمانہ سے بچ گئی۔ مگر اب یہ نسخہ بھی کم یاب ہے۔ اسی نسخہ سے انجمن نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اہل ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

سجّاد حیدر یلدرم

(کوسم سلطان)

(تاریخ عثمانی کا ایک ورق)

وہ ایک شاہانہ کمرے میں رہتی تھی، جس کا سازو سامان جس کے مفروشات جس کے پردے قیمتی بھاری اور ریشمی تھے۔ وہ بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے، زیادہ محتشم تھے۔ اس نظر فریب نمائش اس رنگین دبدبہ میں تنہا، سادہ جو ہستی نظر آتی تھی وہ اس محل سرا کی حقیقی حاکمہ، تمام ملک عثمانی کی حقیقی ملکہ کوسم سلطان تھی۔ وہ میانہ قد، نحیف و نازک عورت تھی۔ اس کے پژمردہ ضعیف مگر کتابی چہرے میں، اس کے خشک رخساروں میں، اس کی اوڑھنی کے نیچے، نہایت احتیاط سے باندھے ہوئے گہرے رنگ کے بالوں میں جن میں کہیں کہیں سفیدی آنی شروع ہوگئی تھی، اس کی ستواں لمبی ناک میں، جس کے نتھنے اکثر متحرک رہتے تھے، اس کے باریک ہونٹوں میں، اگر کوئی یہ ڈھونڈھتا کہ مشرق کا وہ اسرار انگیز حسن و ادا نظر آئے جس نے صدہا سال اپنے باریک پردوں سے عالم ادبیات میں لوگوں کے تخیّل پر ایک خواب کا سا اثر ڈالا ہے، تو وہ وہاں نظر نہ آتا۔ اس کی آنکھیں گہری، اور اثر ڈالنے والی تھیں، جن کو

نہ اس کے سن و سال، نہ اس کی لمبی اور پرخطر واقعات سے مملو زندگی نے بگاڑا تھا۔ ان آنکھوں سے ایسی تیز اور ضیا بار شعاعیں نکلتی تھیں جو اپنے مخاطب کے سب سے زیادہ پوشیدہ، سب سے زیادہ تاریک افکار کو روشنی میں لے آتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کی پلکوں سے چھن چھن کر جو روشنی نکل رہی ہے اس میں فتنہ و فساد یا حرص و ہوس و احتراص کا عنصر زیادہ ہے۔

غرض کہ وہ اپنی معظم و شاہانہ ہیئت مجموعی، اپنے باریک مگر حاکمانہ ابروؤں اور ارادہ و حیات پرور آنکھوں کی وجہ سے اک فقیر کے جھونپڑے سے نکل کر اس پرشان و شوکت محل سرا میں پہنچی، اور وہاں پہنچ کر اس نے خاقان مرحوم کی روح کی گہرائیوں میں گھر کر لیا تھا کہ وہاں سے کسی کے نکالے نہ نکلی۔ ان دیوان خانوں میں جن کے کونے کونے دل پرور دل ربا کوہ قاف والیوں کے پرعظمت ناز و ادا سے بھرے پڑے تھے، اس نے پہنچ کر زندگی کی چہل پہل کو ہزار گونہ زیادہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ اوپر جانے کی کوشش کرتی تھی، اور اپنی ذکا و فراست سے اس نے صرف سب سے زیادہ محبوب اور سب سے محترم ملکہ کا درجہ ہی حاصل نہیں کر لیا بلکہ اس کے اثرات نے رفتہ رفتہ محل سرا سے نکل کر سیاست میں ملک کے امور داخلی و خارجی میں، ثروت و اقتصادیات میں غرض کہ ہر شے میں نفوذ کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر اک دن اس نے دیکھا کہ اس کی فرماں روائی جسے وہ اب اپنا حق سمجھنے لگی تھی، اور اس کا اثر، سب سرنگوں تھے۔ اور

عورتیں اس کی حکم رانی میں شریک تھیں۔ آج وہ دوسرے درجے پر تھی۔ کیا یہ ہی ہونا تھا؟

اور پھر اپنے ہی بیٹے کے سامنے، اور بیٹا بھی کون بیٹا، سلطان ابراہیم۔ محل سرا کے بھاری ریشم کے پردے ہوا سے خاموشی سے ہل رہے تھے۔ ان پردوں نے صدیوں سے، حشمت مآب سلاطین کے وقارِ حکم رانی کو گویا وہاں مس کیا تھا۔ وہ ان کی ہم آہنگ ہو کر خاموشی سے ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ اس کی کام دار پاپوش سے قالین کے اوپر کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ اس کے اعضا سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک چیتیا ہے جو حملہ کرنے سے پہلے خاموشی سے آمادۂ جست ہے اور فاصلے کو جانچتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سرخی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خوف ناک اور باردہ تبسم ہے جو اس کے شدت فکر کو ظاہر کر رہا ہے۔

آج وہ اپنے تئیں نہایت شدید بحران و ہیجان میں پاتی ہے۔ بیٹا اور سلطنت مگر اس کے دل کے باریک ترین تاروں میں اس کی ہستی کے پوشیدہ ترین عنصر ہیں، یہ نہ خیال کیجیے گا کہ کوئی معمولی کوئی قدرتی آرزو پوشیدہ ہے، اس کا مرحوم شوہر، اس کا بیٹا، محل شاہی حتیٰ کہ ایک عظیم الشان ملک و ملت اس کی طاقت و قدرت کے زیادہ کرنے کے وسیلوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ قدرتی طور پر اسے جس چیز سے سب سے زیادہ مربوط ہونا چاہیے تھا، وہ ترک قوم تھی جس سے نکل کر وہ اس درجہ پر پہنچی تھی۔ وہ اس سے

مربوط تھی۔ مگر یہ رابطہ کس قدر ہلکا۔ کس قدر نامحسوس تھا! تخت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے، انقلابات سیاسی کا ظہور ہوا، خون کے دریا بہے، وہ متاثر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے بچوں کی مصیبت بھری زندگی بھی اسے ٹھیس لگائے بغیر گزر گئی۔ اب اس نے معلوم کیا کہ خاندان شاہی کے معظم سلسلے میں کوئی رسی انسان کو باندھ نہیں سکتی، ماں کا درجہ بھی یہاں ہیچ ہے مگر اس دبدبہ و احتشام میں تنہا زندگی بسر کرنے والی عورت نے چاہا کہ اک سلطنت کے اوپر سلطنت قائم کرے، اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔

آج وزیر اعظم احمد پاشا قتل ہو چکا تھا، ینی چریوں کی بغاوت کا ظہور ہو چکا تھا، بازاروں میں، سڑکوں پر اختلال تھا اور ملک سانس لینے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس بات کا منتظر تھا کہ کوئی مہم، موقع پیدا ہو، ہر شخص اس کے لیے چشم براہ تھا اس انتظار میں کوسم سلطان بھی ملک کی شریک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آخری تجعیہ قطعی طور پر زمام حکومت اس کے ہاتھ میں دے دے گا۔ یہ عورت حکومت و قوت کو عزیز ترین خون سے زیادہ چاہتی تھی۔ اور اپنے بیٹے کو بھی اقتدار و اختیار کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لیے حاضر تھی۔

نہیں، نہیں! حکومت و جبروت جس کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی جس قدر انسان سانس لینے کا، اس میں گھر کی ایک لونڈی مداخلت کرے! یہ ہما شاہ، یہ بنی سنوری لونڈی، جو سلطان ابراہیم کو اپنی چھوٹی انگلیوں پر نچا رہی تھی جو اپنی نیلی فام آنکھوں

کی للچائی نگاہوں سے ملک کے سب سے زیادہ قیمتی مقامات کو دشمن کے ہاتھ میں بے پرواہانہ طریقہ سے سلطان سے دلوا رہی تھی، جو اپنی معمولی سی معمولی خواہش کے لئے نہایت مجنونانہ ذریعوں سے اک عظیم الشان سلطنت کو برباد کر رہی تھی۔ یہ چرکس لونڈی! اس بارد خون والی عورت، یعنی کوسم سلطان میں، اس دوسری کے مقابلہ میں اس قدر طفلانہ تہوّر تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے کے لئے حکم دینے سے نہیں جھجکی۔ اس لونڈی کے مقابلہ میں جس نے ایک برس کے اندر اس قدر قدرت و اقتدار حاصل کر لیا تھا اس کا دل نفرت و حسد سے لبریز تھا۔

یہ لونڈی اور اس لونڈی کی خواہشیں! یہ دل بر مخلوق جو شہزادیوں سے خدمت لے رہی تھی مگر جو اپنی تمام دل ربائی و فسوں گری کے باوجود عقل و ذکا سے کس قدر بے بہرہ و عاری تھی۔

جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا شہد سے خالی کر دیا جائے تو مکھیاں ایک شدید بھنبھناہٹ کے ساتھ غصہ سے وہاں سے روانہ ہوتی ہیں، کوسم سلطان کو دور سے ایک ایسی آواز سنائی دی تھی، جو محل سلطانی کے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ ہماشاہ جس کا لقب طرح دار لونڈی پڑ گیا تھا، اس آواز کو نہیں سن رہی تھی، لیکن کوسم سلطان اس آواز کو سن کر اس سے اور بھی زیادہ نفرت کر رہی تھی۔ یہ چرکس عنصر جو اس کا سراسر ضد تھا، یہ ہستیاں جن کا سارا جادو ان کے گورے شانوں، ان کی ہمیکل تمثال گردنوں، ان کے ریشمی بالوں میں پنہاں تھا! کوسم سلطان اک ایسی سریع اور تیز

ط ٹریجیڈی

ذکاوت و عقل طبعی کی مالک تھی، جس پر کوئی حس یا جذبہ غلبہ نہ پا سکتا تھا، اور اس وجہ سے اپنے سلطان ابراہیم کو وہ ناقابل عفو خیال کرتی تھی جو ہما شاہ کے نرم گورے بازوؤں اور شانوں کے سامنے ایک ذلیل غلام بن کر رہ گیا تھا۔ کاش تھوڑے وقت کے لئے بھی حکومت اس کے ہاتھ میں ہو تو یہ جو ہنس کے انداز سے جواہرات سے لدی ہوئی گردن پھرا رہی ہے اسے کس طرح اک چمڑے کی رسّی سے کھنچوائے گی! وہ حسین مرمر کی طرح سفید شانوں پر لہراتے ہوئے بال، جس نے لمبے طرح دار لونڈی کا لقب دیا ہے، وہ زلف زرتار کس کیچڑ میں گھسٹوائے گی! غضب خدا کا، ملک کی یہ حقیقی ملکہ، بادشاہوں کی والدہ، ان لہراتے ہوئے زرد بالوں، ان نیلی نشیلی آنکھوں کے حکم سے قریب تھا کہ جلاوطن کر دی جائے۔

وہ شور آہستہ آہستہ محل شاہی کے قریب ہوتا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شاید دس ہزار دلوں سے ضربۂ بغاوت کی وحشت ناک آواز محل سرا کے دریچوں کے نیچے سے بلند ہوئی۔ غیر منتظم قدموں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکاریں، تہدید آمیز شکایتیں سنائی دے رہی تھیں۔ گویا اک موج شکایت تھی جو انسانوں کے سمندر سے اٹھ رہی تھی۔ جس طرح لڑائی کا گھوڑا جسے لڑائی کی تعلیم دی گئی ہو دھاوے کے بگل کی آواز کو سن کر اپنی تمام قوت اشتیاق کے ساتھ ہنہنا کر جواب دیتا ہے، کوسم کا تمام جسم بھی اک پر شوق ہیجان سے کانپ رہا تھا۔ وہ ان نشانیوں سے واقف

تھی۔ ترک قوم کی طغیان و غلیان میں، وہ قوم کے ساتھ شریک ہو گئی، وہ ترک قوم جو بردبار، صبور ہونے کے باوجود، آخر تنگ آکر کبھی کبھی اپنے حق کا مطالبہ کر ہی بیٹھتی ہے۔ کوسم سلطان باوجود اس کے کہ اک شہری عورت تھی لیکن وہ عقل سے زیادہ حس فطری سے پہچان جاتی تھی کہ کون سی بغاوت اس کے خلاف ہے اور کون سی شورش اس کے حق میں۔ وہ جو ہر شے سے زیادہ اپنی عظمت کی دل دادہ تھی اس جوشش و غلیان ملی کو اپنی تیز ذکاوت سے اس طرح استعمال کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ اس کے عظمت و اقتدار کے بلند کرنے ہی کا اک آلہ ہو جاتے تھے۔ چاہے جوش قومی ہو یا محل سرا کی سازش، وہ ہمیشہ انھیں اپنے حق میں مفید طریقے سے استعمال کرتی تھی۔

شور میں زیادتی ہوئی۔ اب محل کے شہ نشینوں میں، دیوان خانوں میں، دالانوں میں، بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں، دروازے کھلنے لگے، بند ہونے لگے، زینوں پر بھاگڑ کی آواز آنے لگی۔ ہر طرف ڈرپوک طریقہ سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ غرض کہ فضا میں اک پریشانی انگیز انتظار محسوس ہوتا تھا کہ آخر کار اک بڑے خوف ناک دھماکے سے محل شاہی کا بڑا پھاٹک نیچے گرتا ہوا سنائی دیا۔ اس کے بعد دیکھا گیا کہ سیڑھیوں سے انسانوں کا اک ازدحام جو غصے سے پاگل ہو رہا تھا، اوپر چڑھ رہا تھا۔

کوسم اپنے کمرے سے تیزی کے ساتھ باہر نکلی اس نے

اپنے خواجہ سرا ریحان کو اشارہ کیا اور اسے ساتھ لے کر ایسی عظمت و وقار کے ساتھ جو بادشاہوں کی ماؤں کے شایان ہے، آگے بڑھی۔ اس کی طبیعت میں اگر قیامت بھی ہو جاتی تو کوئی گھبراہٹ نہ پیدا ہوتی۔ اس کے نازک کتابی چہرے اور سر کے اوپر ایک سیاہ لمبی اوڑھنی پڑی تھی۔ اپنے چہرے میں چھپانے، لیکن دوسروں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی کامل قدرت کے ساتھ وہ آگے بڑھی۔ اس کے سبک سیر فکر نے ایک منٹ میں اپنے خط حرکت کو تعین کر لیا۔ وہ جانتی تھی کہ خوف ناک سیلاب ملت کو، قوم کے سرکردہ اکابر داعیان کو وہی روک سکتی ہے اور اس کی ہی عقل و ذکا ایسی ہے کہ ان کے خط حرکت کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ وہ آگے بڑھی۔ انسانی چہروں کا یہ سیلاب عظیم جو ایک دوسرے کو ڈھکیلتا ہوا حرم کی دہلیز کی طرف آ رہا تھا اس کی نظر محتشم کے سامنے تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ ان میں سفید ریش سے مزین چہرے، بھاری عماموں سے آراستہ سر تھے۔ یہ وہ مستحکم اور قوی آلہ ہائے انقلاب تھے، جنھوں نے فاجعہ انگیز قدرت دیک دلی سے اپنے ارادے کو پورے کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مگر ان کی آتشیں، محترص آنکھیں متردد و محجوب ہو کر زمین پر گڑ گئیں۔ مصلح الدین آغا کا سفید معزز سر جھک گیا۔ اس کے وفادار مگر جسور چہرے پر اک سرخی پھیل گئی۔ مراد آغا بھی جس کی آنکھیں لمبی سیاہ ابروؤں کے نیچے خوف ناک چمک سے چمک رہی تھیں خاموش ہو گیا۔

کوسم سلطان نے ان کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر سکیں، اور اک تیز مگر بارد آواز سے کڑک کر کہا:۔" کیا تم بھول گئے کہ تم اس خاندان عالی کے پروردۂ احسان ہو؟"

اس فقرے نے وفاشعار مصلح الدین آغا کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ اس مستقیم بڈھے نے اپنی شخصی وفاداری کو ملت کی رفاہ وسعادت پر فدا کر دیا تھا، مگر وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ روک سکا اور نم ناک آنکھوں سے اس نے گفتگو شروع کی۔ اولاً اس نے کانپتی ہوئی بڈھی آواز سے یہ کہا کہ ان کی موجودہ حرکات میں شخصی منفعت کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں "میں خاندان شاہی کا نمک پروردہ ہوں اور میرا بال بال احسان سے جکڑا ہوا ہے۔ ایک سرخ پھٹی عبا لے کر میں آیا تھا، اور اب اس مرتبہ پر مراحم خسروانہ ہی کے طفیل میں پہنچا۔ کاش کہ میں یہ دن نہ دیکھتا!" یہ کہتے وقت اس کی سفید ڈاڑھی سے رنج وندامت کے آنسوؤں کے گرم قطرے ڈھلک رہے تھے۔ اپنے حسیات وجذبات کو ندامت کے درجہ تک لا کر وہ رکا۔ اپنے چاروں طرف کے آدمیوں میں جو سکوت طاری تھا اسے دیکھ کر متاثر ہوا اور اس کے دل میں محبت وطن وملت پھر جوش زن ہوئی اور پھر اس نے حرارت آمیز طریقہ سے گفتگو شروع کی۔ اب اس نے ملک کے اوپر جو کچھ گذر گیا، اک اک کر کے گنانا شروع کیا۔" دشمن سرحد سے گزر کر ملک میں داخل ہو چکا ہے، آب نائے میں اعدا کے فوجی جہازوں کا بیڑا پھیلا ہوا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز کی

نرماہٹ غائب ہوگئی اور ایک بڈھے شیر کی طرح گرجنے لگا: "ملک میں بدامنی اور ظلم پھیلا ہوا ہے، ناحق گلے کٹ رہے ہیں، بے گناہ سزائیں پا رہے ہیں، رعایا کو مال و جان کی امنیت نہیں"۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں اک غم گین، مگر دین دارانہ صمیمیت قلب کی رقت پیدا ہوئی، اور اس نے کہا "احکام شرع کی پابندی ہونی چاہیے"۔ والدہ سلطان اپنی متانت کو قائم رکھے ہوئے تھی، کبھی ان کو اب تک کے سکوت پر سرزنش کرتی تھی اور کبھی قطعی دلائل سے انھیں خاموش کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب اس اژدحام میں بے صبری کی علامتیں نمودار ہونے لگیں۔ بھیڑ ایک دوسرے کو ڈھکیلتی ہوئی آہستہ آہستہ اک اک قدم آگے ہوتی جاتی تھی اور اور لوگ بھی باتوں میں دخل دینے لگے تھے۔ کبھی کوئی اکھڑ جاہل ینی چری، کبھی کوئی باوقار مگر پرجوش عالم۔ شیخ الاسلام عزیز آفندی باری باری سے کوسم سلطان سے مباحثہ کرتے۔ مگر کبھی کسی کے ذہن میں اتنی جرأت کا خیال نہ پیدا ہوتا تھا کہ بارعب و معظم والدۂ سلطان کے آگے سے نکل جائے۔ جاہل و عالم، افسر و سپاہی سب اس کے سامنے اپنے سینوں پر ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے اس سے عرض حال کرتے تھے، اور اپنے حالات و خیالات کے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ جماعت جو انقلاب و اختلال کے لئے نکلی تھی ان کی حرکات میں اک وقار تھا جو مغربی ممالک کی انقلاب انگیز جماعتوں کی شدت و ہیجان کے مقابلے میں ان کو ممیز کرتا تھا۔ آخرکار اک بے صبر، آتشیں عمامہ

پوش عالم جو ابھی اپنی جلاوطنی سے واپس آیا تھا حنفی آفندی، اس مباحثے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی پوری قدرت استدلال اور طلاقت لسانی سے اس بغاوت کے حق و عدالت پر مبنی ہونے کو ثابت کرنا شروع کیا۔ دیوان خانوں میں بھگدڑ پڑی ہوئی تھی اور وہ اس بغاوت کے اسباب کو ایک ایک کر کے قطعی اور مکمل فقروں سے جتا رہا تھا۔ اس کی آواز سے محل سرا کی غم آلود نیم تاریکی میں عکس صدا پیدا ہو رہا تھا۔

"دشمن نے ہر طرف ہم کو گھیر لیا ہے۔ رشوت، بے ایمانی سے نظام سلطنت تباہ و برباد ہو گیا، ناقوس اور گھنٹوں کی آوازوں سے موذن کی آواز دب گئی۔ عباد اللہ کے مال و جان کی اہمیت ضایع ہو گئی۔ خود والدۂ سلطان پر بھی ظلم کیا جا رہا ہے۔ حضور آپ اس ملت کی والدہ ہیں۔ آپ حقیقی معنوں میں ام المومنین ہیں اسی لیے ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔"

اس کے بعد سب نے یک زبان و یک دہان ہو کر کہنا شروع کیا "شہزادے کو ہمیں دے دیجئے اور للہ اس قوم کے نجات حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ پیدا کیجئے۔" کوسم سلطان نے محسوس کیا کہ اس کا ضعیف جسم اس کے بیٹے اور سلطنت کا یگانہ محافظ ہے۔ کیا، اگر ان کی خواہش پوری کرے تو یا انھیں لوٹا دے تو اس کے بیٹے کے نزدیک اس کو اپنی پرانی قوت مل جائے گی؟ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ محل سرا کے غم آگین سکون میں اک خوف آمیز آواز سنائی دی۔ ہما شاہ کی خزینہ دار بزم عالم

کہہ رہی تھی: "خدا کے لئے حضرت ملکہ ماشاہ کو بچایئے۔" اس وقت کوسم سلطان جو اپنے بیٹے کے سقوط و تباہی کے مقابلہ میں اک سد آہنی کھڑی تھی ہٹ گئی اور اس نے کہا:-

"لو میں جاتی ہوں شہزادے کو باندھ کر لاتی ہوں" اور اس ماں کا جس نے وقت ضرورت دست ملت کو تخت اوندھا کرنے سے نہ روکا عمیق صمیمی دعاؤں اور تحسین کے نعروں نے دیوان خانے تک تعاقب کیا۔

ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات

(برج موہن کیفی وتاتریہ)

متمدن قومیں ایک دوسرے سے میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ سب قوموں کے جغرافی تعلقات، زمین کے خواص اور آب وہوا ایسی چیزیں ہیں جو یکساں نہیں رہ سکتیں۔ اس وجہ سے ان کے وہاں کی پیداوار اور صنعت کاری بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں اول اول اجناس یعنی ملک کی پیداوار اور کاشت کاری کی ادلا بدلی کرلتی ہے اور یہ ادلا بدلی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتی ہے۔ خواہ وہ تمدن کی کسی منزل میں ہوں۔

یہ میل جول یا مبادلہ جب مادی دنیا سے نکل کر قوموں کی شائستگی اور تہذیب کی ترقی کی نسبت سے ذہنی مبادلہ کی شکل اختیار کرتا ہے تو بین الاقوامی کلچر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسی کلچر اور اس کے بین الاقوامی تاثر سے متعلق چند باتیں آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔

کلچر کو تہذیب یا سبھیتا وغیرہ کوئی نام دیں لیکن یہ لفظ اپنی اصلی حیثیت ہی میں اتنا جامع واقع ہوا ہے کہ اسے چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا اس لئے یہاں اسی لفظ سے کام لیا جائے گا۔

قدیم آریہ لوگ جب اس ملک میں آئے تو انھوں نے یہاں ایک اچھی اور ترقی یافتہ تہذیب پائی جس کے آثار اب ہڑپا اور موہن جوداڑو میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ مفتوح تھے اور ہمارے آریہ بزرگ فاتح۔ لیکن بہتر ہتھیار اور جنگ کے فن کی اعلیٰ قابلیت قومی میل جول اور کلچرل ارتباط کو روک نہ سکی۔ دیو بانی اب وہ بانی نہ رہی جس کو مقدس وید کی زبان ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ زبان میں تبدیلیاں دیکھتے ہوئے رشی پانی نے ضروری سمجھا کہ اس مقدس زبان کی حفاظت اس کی تنظیم سے کرے۔ اس ضرورت نے اشٹادھیائی کی شکل اختیار کی۔ اس کے ساتھ آرین فاتحوں کے لئے اپنا مفتوحوں کا جانتا اور سمجھنا بھی ضروری تھا۔ اس کا ثبوت ورارچی کی پراکرت گرامر جیسی کتابیں ہیں۔ بالکل ایسی ہی ضرورت پچھلی صدی کے اوائل میں انگریزوں کو ہندوستان میں پیش آئی جسے گلکرائسٹ اور فاربس وغیرہ کی ہندوستانی گرامروں نے پورا کیا۔

کلچر کے بین الاقوامی عمل کے سلسلہ میں آپ کے سامنے انسان کی تاریخ کے دفتر کھولنے بے سود ہیں۔ میں گفتگو کو وطن مالوف تک ہی محدود رکھوں گا۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا تاریخی اعتبار سے درست ہوگا کہ ہندوستان میں تین عظیم الشان تصادم یا کھئیے اتصال کم و بیش پختہ کلچروں کے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے اور اسی کو کافی سمجھنا چاہیے۔ دوسرا تصادم وہ ہے جو مسلمان فاتحوں کے اس ملک کو اپنا وطن

بنا لینے کے وقت سے ظہور میں آیا۔ تیسرا تصادم وہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی پروگرام ترک کر دینے اور ملک گیری کے پروگرام کو سامنے رکھ لینے سے وقوع پذیر ہوا۔ یہاں اس نمبر ۲ کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس بارے میں مسلمانوں کے یہاں آنے پر جو کچھ ہوا اس کی نظیر ہم کو یونان میں اہل روما کی آمد میں بہت کچھ ملتی ہے۔ یہ واقعہ اب تشریح اور استدلال کا محتاج ہے کہ سندھ میں عربوں کی آمد سے قطع نظر جو مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ آئے اور یہیں کے ہو گئے، وہ کون تھے؟ کس تہذیب و تمدن کے علم بردار اور کس کلچر سے بہرہ در تھے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ان نصابوں میں نہیں ملے گا جو اسکولوں اور کالجوں میں ہمارے نوجوانوں کے ذہن پر لادے جاتے ہیں۔ بحث اس سے نہیں کہ وہ سلجوقی تھے یا غوری پٹھان، چنگیزی مغل تھے یا کون؟ بحث اس سے ہے کہ وہ کون سی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے؟ محض مسلمان یا قبیلہ کا نام لے دینا اصل مبحث پر روشنی نہیں ڈالتا۔

تاریخ کے ملاحظہ سے واضح ہو گا کہ جو مسلمان شمال مغربی دروں کے راستے سے ہندوستان میں آئے، وہ خواہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں، ایران کی تہذیب اور کلچر کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی اور ان کا تخیل اس کلچر سے متاثر تھے

جن کا ابتدائی خاکہ شاہ نامے میں پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایرانی کلچر اور لٹریچر کا رنگ ان کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا تھا اور چوں کہ ایرانی اور انڈو آرین، یعنی ہندوستان میں آنے والے آرین، ایک ہی مٹی کے دو ٹھیلے تھے، جس کی تصریح کی ضرورت نہیں، اس وجہ سے ان مسلمانوں کے کلچر اور ہندوستانیوں کے کلچر میں بہت کچھ ہم آہنگی اور اپنایت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان رہ کر اس خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہو گئے کہ رواداری اور بھگتیا کا اوتار بن گئے۔ یہ بھلے جھگڑے اٹھانے اور فتنے جگانے کے ہیں کہ مفتوح اپنے فاتحوں پر غالب آ گئے یا یہ کہ فاتح اپنی فاتحانہ خود اعتمادی اور انفرادیت سے محروم ہو گئے۔ امر واقع یہ ہے کہ دونوں کلچروں کے مزاج کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ ان کا رد و بدل ہونا ہی ارتباط کا قائم ہو جانا تھا۔ یہ ارتباط نگاہ اولین کی اشتیاق انگیزی سے کم نہ تھا۔ کلچروں کے اس ارتباط کے کارنامے ایک نہیں دو نہیں بہت سے اور گوناگوں ہیں۔ قوموں کے باہمی تعلقات کے ارتقا میں یہ ہوا کرتا ہے کہ پہلے ایک کیفیت اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اہل غرض اس کو سیاسی رنگ دے دیتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ کلچرل ارتباط پہلے ناگزیر صورتوں میں اپنے آپ پیدا ہوا۔ بعد میں اس سے سیاسی استفادہ کیا گیا۔ آپ ادبی زاویۂ نگاہ سے اس مسئلے پر نظر ڈالیں اور فرمائیں کہ نئی زبانیں اور لٹریچر جو اس کلچرل ارتباط سے پیدا ہوئے کیا اس کے متعلق کسی کا معہود ذہنی یا سیاسی

مصلحت اندیشی پر مبنی کیا جا سکتا ہے؟ مہابھارت یا گیتا وغیرہ کے ترجموں کی نسبت جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے ایسا گمان ہو سکتا ہے لیکن خان خاناں رحیم اور رسخان کا ایسا اچھا ہندی کا شعر کہنا اور ملک محمد جائسی کا ہندی میں پدماوت تصنیف کرنا کون سی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی بتایا جائے گا۔ ایک طرف یہ ہوا تو دوسری طرف ٹیک چند بہار مخلص اور وارستہ نے وہ جیّد کتابیں لکھیں جو ایران میں مستند مانی گئیں۔ اگر یہ ہندو یا مسلمان اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے تو اور کلچروں کا ارتباط، یہ فقرہ ہی بے معنی تھا۔ مگر یہاں ایسا ہوا ہی نہیں۔

لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوا کرتا ہے خاص کر قومی اور اجتماعی معاملوں سے متعلق ان کی یادداشت بہت سست ہوا کرتی ہے۔ اس صورت میں کج بحثی کی آڑلی جاتی ہے۔ خوف دلایا جاتا ہے کہ اگر ان میں اور ہم میں ارتباط ہو گیا تو ہماری ملی انفرادیت اور دھارمک سوتنترتا پھر کہاں! ہم کیوں اپنی قدیم قومی روایات گنوا بیٹھیں؟ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہوا نہیں۔ سنیئے جب کلچرل ارتباط کی تنظیم نسل، زبان اور قومیت کے محدود احاطہ سے باہر عمل پیرا ہوا تو اخلاقی اور ملی معیار سے متعلق یہ نتیجہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ انسانوں کے ذہن غیر مقامی ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کے شعور کا نفسیاتی محور وسیع اور زاویۂ نگاہ فراخ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگلے وقتوں میں ایسا ہوا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے ملی تو ان میں سے ایک اپنی قومی انفرادیت

کھو بیٹھی۔ لیکن یاد رکھیے، اور خوب یاد رکھیے کہ یہ نتیجہ تھا مذہبی میل کا۔
آج کل کا کلچرل اتحاد زیادہ تر مختلف روایات کا میل ہوا کرتا ہے۔
روایات کا بہترین نتیجہ ان کا باہمی آزادانہ ملاپ ہے۔ عہد حاضر میں کلچروں کا باہم تبادلہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں کہیے، سمونا ایسا ہے جیسے ایک پہاڑی نالے سے نہر نکال کر میدانی علاقہ کو سیراب کرنا۔ وہاں زمین کم تھی، پتھر تھے یا پانی، اس لیے زراعت برائے نام تھی، جب کہ یہاں زمین زیادہ تھی اور پانی برائے نام امیدیں بادلوں کے رحم کی منتظر رہتی تھیں یا لہو پسینہ ایک کرکے چپہ بھر زمین ہل کے سپرد کی جاتی تھی۔ اب یہ ہوا کہ ان کو غلہ مل گیا اور ان کو پانی۔ بین الاقوامی کلچرل اتحاد کیا ہے؟ دو قوموں کا ذہنی اور اخلاقی لین دین۔ میں کہتا ہوں کہ ہندووانی روایات اور کلچر میں کچھ خوبیاں ہیں تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ ان خوبیوں کو عام کریں، ڈبیا میں بند کرکے نہ رکھیں اور اسی طرح اسلامی روایات اور کلچر میں اگر کچھ محاسن ہیں تو وہ انھیں عالم گیر بنائیں اور مقفل و محدود کرکے نہ رکھ چھوڑیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ تبصرہ اور موازنہ سے کام لیا جائے لیکن یہ کام محض تخیل سے سر نہیں چڑھ سکتا، اس کے لیے طبع سلیم اور جرأت عمل درکار ہے۔
آپ بھولتے ہوں تو اور بات ہے ورنہ یہ کام ہو چکا ہے۔
ہم ہندو مسلمانوں کو خصوصی طور پر اور کل برادران وطن کو عام طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہمارے بزرگوں کی دیدہ وری کی بدولت ہو چکا ہے۔ اسی آپ کے وطن میں جزیہ لگا اور پھر

منسوخ ہوا۔ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قوموں کے رسم و رواج اور طرز ماند و بود اور ان کی ذہنیت بدلتی رہتی ہے۔ اساسی اعتقاد جوں کا توں رہتا ہے۔ لیکن اس کے نفسیاتی ذریات کی پرواز بدل جاتی ہے۔ انسانی شعار کا اصلی جوہر خلوص اور راست بازی ہے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کا جوہر موالات اور رواداری ہے، اور ان جوہروں کو جلا دینے میں کلچرل اتحاد اور ادبی و لسانیاتی ارتباط کی تشکیل ہوا کرتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے اور آپ کے قول میں جنبہ داری یا عصبیت کا لوث بتایا جائے۔ اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک یوروپین مسٹر جوڈ کی تازہ تصنیف "دی اسٹوری آف انڈین سویلیزیشن" سے استفادہ کروں۔ لکھا ہے۔

"قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے تخیل کا اسلامی خیالات سے تصادم ہوا۔

ہندوستان میں مختلف نظاموں کی یہ مڈبھیڑ دیسی کلچر کے غلبہ میں صورت پذیر ہوئی اور اسلامی ذہنیت میں کچھ ہندوانیت جذب ہو گئی۔" صفحہ ۵۶

یہ تحقیق ایک غیر ہندو اور غیر مسلم کی ہے۔ اس غیریت کے باوجود بھی ممکن ہے کہ اس مصنف کی تحقیق اور دریافت ذاتی پسند اور شخصی رجحان کا رنگ لئے ہوئے ہو جس سے وہ بے خبر رہا۔ کچھ بھی ہو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاثر کے غلبہ سے قطع نظر، ہوا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت فکر و تخیل باوجود

ان کے مذہبوں کے اختلاف کے شیر و شکر ہوگئی۔ غلبہ ہندوانہ کلچر کا رہا یا اسلامی کا یہ امر تنقیح طلب نہیں۔ نہ ان کا اثر اس تاریخی نتیجے پر پہنچتا ہے جس کی مولود ہماری ہندو مسلم یا ہند ایرانی کلچر ہے۔

اس کلچرل ہم آہنگی میں جو حصہ ہماری ورنیکولر یعنی دیسی زبانوں اور ادب کا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ چنڈی داس چیتنیہ۔ ودیاپتی کبیر۔ نام دیو۔ ٹکارام۔ نرسنگ مہتا اور گرو نانک کے نام اس ضمن میں ذکر کے قابل ہیں۔ ایسے اور بہت سے بزرگوں کے نام آپ کو بھگت مالاؤں میں ملیں گے۔ ان کی تلقین اعتقادی فراخدلی سے شروع ہو کر کلچر اور معاشرت کی وسیع نظری تک نتیجہ پذیر ہوئی۔ اردو یا ہندوستانی اپنی تنظیم اور تدوین سے پہلے اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ کرتی رہی اور اب تک کر رہی ہے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اردو والوں نے اپنا کوئی پنتھ یا مٹھ قائم نہیں کیا، لیکن وہ کام کر گئے جو قوموں کے کلچرل اتحاد میں بے نظیر ہے۔ انھوں نے دیر و حرم اور شیخ و برہمن کو ایک جگہ لا بٹھایا۔ ان کا فکر استقرائی تھا، اس لئے معاشرت اور روزانہ زندگی پر چھا گیا۔ یہ بدیہی امور واقعہ ہیں، جو تشریح کے محتاج نہیں۔ عمارات کی ملکہ یعنی تاج محل میں ہندو ہاتھ کہاں کہاں نمایاں ہے۔ پراکرت اور اپ بھرنش بھاشاؤں کے لغات پر کیا اثر ہوا۔ مغل یعنی ایرانی نقاشی اور راج پوت پینٹنگ میں باہم کیا اخذ و ترک ہوا۔ ہمارے قدیم سنگیت کے موسیقی میں کیا جدت آفرینی یا کہہ دیجئے بدعتیں ہوئیں اور کتنی نئی سنکیرن راگنیاں پیدا ہو گئیں۔

یہ اور ایسی بہت سی چیزیں ہندو مسلم کلچروں کے ارتباط اور اتحاد کے پھل ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شق ایک علاحدہ دفتر چاہتی ہے۔ مفکرین اور شاعروں نے جو اس ارتباط کے سب سے بڑھ کر علم بردار تھے وہ کام کیا۔ جو رہتی دنیا تک رہے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مثال کے طور پر متقدین اور متوسطین اور عہد حاضر کے بعض شعرا کے کلام سے استفادہ بے محل نہ ہوگا۔

ولی مرحوم کا قول ہے ؎

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنّار کا

حضرت آبرو مغفور نے فرمایا ہے ؎

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبیح کرے فراموش زنّار بھول جاوے

میر تقی کا قول ہے ؎

نغمۂ عشق سے ہے سبحہ و زنار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

منشی مادھورام جوہر کا ارشاد ہے ؎

دیر و مسجد پہ نہیں موقوف کچھ اے غافلو!
یار کو سجدہ سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

استاد ذوق کا قول ہے ؎

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے جھگڑے شر کے ہیں

حضرت امیر مینائی نے یہ تلقین کی ہے ؎

مشرب صلح کل ہو لے زاہد!
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے

فصیح الملک داغ مرحوم کا قول ہے ؎

سرِ نیاز سلامت رہے پئے تسلیم
نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے

چکبست نے یہ فیصلہ کیا ہے ؎

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

حضرت جلیل مانک پوری نے فرمایا ہے ؎

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر
کیا کہیں گے تمہیں سب گبر و مسلماں دل ہیں

ثاقب بدایونی کا مشاہدہ ہے ؎

تمہارا بول بالا ہر جگہ اللہ والوں میں
یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جب تک شوالوں میں

اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جائے گا۔ نہ اس سے بحث کی جائے گی کہ مسلمان اور ہندو کے ان اور ایسے ملفوظات نے جمہور کی ذہنیت کو کیا رنگ دیا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ شاعر اپنی قوم کی زبان اور اس کی معاشرت کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ صرف دو شعر اور پیش کروں گا بیشتر اس سے کہ موضوع کے اور شعبوں پر نظر ڈالوں ایک بھگت شاعر نے دعویٰ کیا ہے ؎

ذات پات پوچھے نہ کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کو ہوئے

یہ دعویٰ دلیل کا محتاج نہیں۔ مسلمان شاعر نے اعلان کیا۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

آپ نے کلچرل اتحاد کے کارنامے ملاحظہ فرمائے۔ آپ نے اسلاف کے شاہ کاروں کو اپنے حافظہ میں ٹٹولا۔ آپ ہندو مسلمان حضرات میرے وطنی بھائی جس طرح رہتے ہیں، کیا اس کے ملاحظہ کے لئے آپ کو کسی شیش محل یا آئینہ خانہ میں لے جاؤں۔ معاشری صلاحیت، یہ سمبھیتا، یہ کلچرل اتحاد، یہ سوشل یگانگی اور یہ رواداری کیا کسی معجزے یا کرامت، کسی شاہی حکم یا فتوے سے وقوع میں نہیں آئی۔ یہ نتیجہ ہے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے مدت العمر کے حسن عمل کا اور جلب منفعت اور ”خذ ما صفا ودع ماکدر“ کے اصول کا۔ جماعتوں کا طرز عمل نتیجہ پیدا کرنے کو ایک خاص مدت اور استقلال چاہتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا کئی نسلوں کی ان تھک اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جب ہی تو انگلستان کے مفکردں اور مورخوں کو یہ کہنا پڑا جس کی تفصیل بالاجمال آگے پیش کی جاتی ہے۔ سنیئے۔ یورپ کی تازہ ترین تصنیف آپ کی نسبت رائے دیتی ہے۔

”ہندوستان کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ زاویۂ نظر پر نسلوں کے ملاپ کے جو اہم نتیجے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے

اولین نتیجہ اساسی یگانگی یا یونٹی اس سے کہیں زیادہ بیّن اور مستقل ہے جو ایک ہی جغرافی رقبے میں قربت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یورپین یعنی اہل فرنگ بھی تو ایک ہی جغرافی رقبے میں اکٹھے رہتے ہیں جو رقبہ ہندوستان سے بہت مختلف نہیں ہے لیکن جیساکہ وہ جنگیں جنھوں نے یورپ کی تاریخ کو بدنام کردیا ہے اور وہ تنازعے اور باہمی رقابت کے جھگڑے جو اس وقت لیگ آف نیشنس کی کمر توڑ رہے ہیں، صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ یورپ کے باشندے اتفاق اور یک جہتی کے احساس کی اس اثر پذیری سے محروم ہیں، جس کا امتیاز ہندوستان کے باشندوں کا حصہ ہے۔ قصہ مختصر ہم اس معنوی صحت کے ایک یورپین کا ذکر نہیں کرسکتے جس کے ساتھ ہم ایک انڈین کا ذکر کرسکتے ہیں جو رنگ، جاتی اور مذہب کے اختلافوں کے باوجود تمام دوسرے اہل ہند کو اپنا ہم وطن اور ہم جولی سمجھتا ہے اور ہندوستان کو اپنا وطن۔"

(اے اسٹوری آف انڈین سویلیزیشن ۱۹۲۶ء صـ ۲۲۴)

آپ کے ہم وطنوں کے حق میں یہ قطعی رائے اور موازنہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔ یہ اسی کلچرل یونٹی کا ظہور ہے جس نے ہماری معاشرتی اور سیاسی قسمتوں کو ایک کردیا ہے لیکن ملاحظہ فرمایئے واقعات سے چشم پوشی اور سہل انکاری ناممکن ہے۔ کچھ بات تو ہے جس نے مدراس کی اسمبلی کو اور اس کے اسباب تبست و کشاد کو تلی مناقشوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی تحریک کی۔ کوئی بات تو ہے جس نے ملک کے دوسرے سرے

میں پنجاب کی اسمبلی اور اس کے سرگرم دستور اعظم کو یونٹی کانفرنس کی ترغیب دی جس نے خلوص اور جوش سے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ جدید واقعات ہیں جن کو کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا، جن سے کوئی صحیح دماغ رکھنے والا انکار یا بے اعتنائی نہیں کر سکتا۔

اب کیا یہ سمجھا جائے کہ ہمارا وطن" کایا پلٹ ہو گیا اور صدیوں کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا"

اپنا قول تو یہ ہے۔

جو عوارض اس وقت ہمیں در پیش ہیں وہ اپنی نوعیت میں اگلے وقتوں کے عوارض اور ماحول سے مختلف ہیں۔ ہندوؤں اور ہندوؤں کے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے، مسلمانوں اور مسلمانوں سے کے، سکھوں اور سکھوں کے باہمی تعلقات جیسے کچھ عریاں واقعات ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں، ہماری عہد حاضر کی تواریخ کے چہرے پر خوش نما داغ ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن سوال پھر بھی وہیں کا وہیں رہتا ہے کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟

وہ عہد گذشتہ کی تاریخ کو دماغ میں رکھے ہوئے کس قبیل میں آتے ہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس کے گرد دوسرے تمام مسائل طواف کرتے ہیں۔ وطن کے ہر ذی ہوش، ہر حریت شعار، ہر مفکر کا اہم فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کرے۔ غور کرنا ہے کہ آیا موجودہ عوارض کی اصلیت اقتصادی اور معاشی ہے یا ملی اور قومی؟ اگر آپ مجھ سے اس سوال کا جواب طلب فرمائیں تو میں اسے آپ کی ستم ظریفی کہوں گا۔ معاف

فرمائیے اس کلیے کے لیے۔ ایسے مہتم بالشان اور دور رس مسئلے ایک لفظ یا ایک جملہ کہہ دینے سے طے نہیں ہوا کرتے۔ جب تک ہر نقطۂ نظر کے اصحاب اس نیت سے مل کر نہ بیٹھیں کہ اس مسئلے کو حل کر ہی ڈالنا ہے، کچھ فائدہ قیل و قال سے نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں ایک بات ضرور آپ سے کہنی ہے۔ شروع میں تین کلچرل تصادم یا اتصال آپ کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ اب تک نمبر ۳ کی نسبت کچھ نہیں کہا گیا جس کا تعلق مغربی کلچر سے ہے۔ یہ کل کی بات ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کا اپنی دیسی فضا میں کیا رنگ تھا اور ہم سے مل کر اس کے کیا تیور ہیں؟ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے۔

میں یہ دیکھ کر باغ باغ ہوں کہ ان مسائل پر غور و فکر کی خواہش اہل ملک میں پیدا ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس خواہش کی محرک خلوص اور بہبود وطن ہے۔ جب ایک کام کرنے کی ٹھن جائے تو کامیابی کے سو راستے نکل آتے ہیں۔ فلسفۂ نفسیات جماعتوں کی ذہنیت اور جدت عمل کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے کہ جب ایک امر جماعت کے ذہن میں استواری کے ساتھ جاگزیں ہو جاتا ہے اور اس کے حل کی تدبیر خود ہی سرعت سے نکال لیا جایا کرتی ہے تو وہ اپنے فیصلے پر فوراً عمل پیرا ہو جاتی ہے۔ جماعت میں ذوق عمل کی کمی نہیں ہوتی۔ کمی ہوتی ہے تو احساس اجتماعی کی۔ موجودہ صورت حال سے متعلق ہندوستانی قوم کا خواہ کوئی فیصلہ ہو لیکن ایک حقیقت ہے جو اس سوال اور اس نوعیت سے بالاتر ہے، وہ کلچرل

ہم آہنگی ہے۔ مغربی اتصال نے خواہ کوئی شکل اختیار کی ہو، موجودہ صورت چاہے کچھ ہی ہو، کلچرل یونٹی جو ہم میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کے رنگ مدھم نہیں پڑنے دینا چاہیئے۔ اس کی ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کبھی حد سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہی ہماری نجات کی شاہ راہ ہے اور یہی ہمارے حریت کے خزانے کی کنجی۔ اس بارے میں کاش ہمارا لائحۂ عمل وہ ہو، کاش ہمارا وفورِ ذوق ویسا ہی ہو جس کا چربہ مہاکوی ودیا پتی نے اپنے ان اشعار میں نہایت خلوص اور جذبہ سے کھینچا ہے۔ ان الہامی اشعار کے ترجمہ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

فرماتے ہیں ؎

دیکھتا ہوں جب سے اس جگ میں ہوں میں اس کا سروپ
چین پھر بھی میری آنکھوں کو نہیں اک پل ہوا
ہے جگوں سے من کو میرے میل اس کے من کے ساتھ
اس پہ بھی ہے شانتی کی پیاس ہی من کو سدا

پنڈت برج نراین چکبست

(مسعود حسن ادیب رضوی)

عہد جدید کے جن شاعروں نے اردو شاعری پر مستقل نقش چھوڑا ہے اور اردو شاعری کے جدید طرز کو مقبول عام بنایا ہے اُن میں حضرت چکبست لکھنوی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس عہد کے بعض ممتاز شاعروں نے اپنی شاعری کے موضوع کے ساتھ اپنا اسلوب بھی بدل دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت ان کے کلام سے کچھ متوحش سی رہی۔ مگر چکبست نے نئے خیالات کو اسی اسلوب سے ادا کیا جس سے لوگوں کی طبیعتیں مالوس تھیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا۔

ہماری قدیم شاعری میں داخلیت کا غلبہ تھا۔ جدید شاعری میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے۔ قدیم شاعری میں جو مرتبہ مطالعۂ نفس کا تھا جدید شاعری میں وہی درجہ مشاہدۂ حیات کو حاصل ہے۔ چکبست کے یہاں بھی خارجی عنصر کی زیادتی ہے۔ مگر داخلیت کی آمیزش کے ساتھ۔ مشاہدے اور مراقبے کے اسی دل کش امتزاج کا نتیجہ ہے کہ چکبست کا کلام ان لوگوں کو بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتا جو شاعری کو قدیم معیار سے جانچتے ہیں۔

ہمارے قدیم شاعروں کا کلام ہم کو ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیتا ہے، جہاں ہم اس دنیا کے شور و شر سے کچھ دیر کے لئے نجات پا جاتے ہیں۔ لیکن اس دور کے جدید شاعروں کے دل میں یہ سما گئی ہے کہ ہماری شاعری اور

ہماری زندگی میں پوری مطابقت ہونا چاہئے۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری سے رومانیت کا عنصر خارج کر کے اس کی جگہ اصلیت کو دے دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بے اطمینانی، بے چینی، بدنظمی ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں وہی دورِ جدید کے شاعروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے، اور ہم کو اس سے نجات پانے اور اپنا دماغی توازن درست کرنے کے لیے کوئی امن اور سکون کی جگہ ان کے یہاں نہیں ملتی۔ چکبست بھی جدید طرز کے شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی روحانی محبت کو اپنی شاعری میں بہت کم جگہ دی ہے لیکن وطن کی محبت کے گیت اس جوش اور خلوص سے گائے ہیں کہ ان کے کلام میں ایک رومانی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جس سے اس کا اثر بہت بڑھ گیا ہے۔

ہمارے قدیم شاعر کسی مقصد کے لیے شعر نہیں کہتے تھے۔ جو خیال ان کے دماغ میں آتا تھا، جو اثر ان کے دل پر پڑتا تھا اس کی سچی تصویر لفظوں میں کھینچ دیتے تھے، مگر آج کل بہت لوگ شاعری کو افادی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ پرانے معیاروں کے اعتبار سے شاعری اور خطابت دو مختلف چیزیں تھیں، مگر اس زمانے کے نئے معیار نے شاعری اور خطابت کا فرق نظرانداز کر دیا ہے۔ لوگ خطابت ہی کو شاعری سمجھنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانے کی بہت سی نظموں کے عنوانوں ہی میں خطابت کا لفظ شامل ہے مثلاً ذاکر سے خطاب، نقاد سے خطاب، کسان سے خطاب، مزدور سے خطاب۔ یعنی شاعری اب ایک طرح کی منظوم خطابت کا نام ہوگیا ہے۔ بہر حال افادی نقطۂ نظر سے قدیم رنگ کی جذباتی شاعری اور جدید طرز کی خطابی شاعری میں صرف ارادے اور مقدار کا فرق ہے۔ جذباتی شاعری کی

افادیت غیر ارادی اور خطابی شاعری کی ارادی ہوتی ہے۔ جذباتی شاعری میں رومانیت زیادہ ہوتی ہے اور خطابی شاعری میں افادیت۔ چکبست کے کلام میں جذباتی شاعری کی رومانیت اور خطابی شاعری کی افادیت کا ایک معتدل امتزاج نظر آتا ہے۔

چکبست نے مختلف موضوعوں پر نظمیں کہی ہیں، مگر ان کی بنیاد جس جذبے پر قائم ہے وہ وطن کی محبت اور اہل وطن کی بہبود کی خواہش ہے۔ چکبست نے اپنی نظموں کے مجموعے کا نام صبح وطن رکھا ہے۔ اس سے بھی اسی بنیادی جذبے کا اظہار ہو رہا ہے۔ چکبست حقیقی وطنیت اور صحیح قومیت کے علم بردار تھے۔ ہمارے ملک میں جس پر شور، تنگ نظر، اور تعصب پرور قومیت کا آج کل دور دورہ ہے۔ چکبست کی شاعری گویا اس کا ردعمل ہے۔ وہ ہندوستان کو ہندو مسلمان دونوں کا ملک اور وطن سمجھتے ہیں اور اس کی بہتری اور آزادی کے لیے تمام اہل ملک سے یکساں طور پر اپیل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں کسی خاص جماعت یا فرقے کو مخصوص طور پر مخاطب نہیں کیا ہے۔ چکبست ہندو تھے اس لئے اگر وہ ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل نظر آتے تو کوئی تعجب نہ تھا۔ مگر انھوں نے جب کبھی خصوصیت کے ساتھ ہندوؤں کو مخاطب کیا تو اسی وقت مسلمانوں سے بھی مخصوص طور پر ضرور خطاب کیا ہے۔ مثلاً جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو تشدد ہو رہے تھے ان کے خلاف اہل ملک کو برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے "فریاد قوم" کے نام سے ایک نظم شایع کرتے ہیں۔ اس نظم میں ایک جگہ ہندوؤں کو خاص طور پر یوں مخاطب کیا ہے ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار　　اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار　　تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم وارجن کا نام ڈوبے گا

اس کے بعد ہی مسلمانوں سے یوں خطاب کرتے ہیں :-

دکھادو جوہر اسلام اے مسلمانو　　وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو　　جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

اس نظم کا ایک بند اور ملاحظہ ہو :-

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار　　پکارتے ہیں مدد کے لیے درو دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار　　زمین ہلتی ہے اڑتا ہے خون بن کے غبار
جگہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

رانائے چتوڑ اور شہنشاہ اکبر میں مذہبی اختلاف کے علاوہ شدید مخالفت بھی تھی۔ لیکن ہندوستان کی عظمت قائم رکھنے میں دونوں شریک ہیں۔ اس طرح اس بند کے ذریعے شاعر ہندوؤں اور مسلمانوں سے نہایت پرزور طریقے پر اپیل کرتا ہے کہ مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باوجود ملک کی عزت قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے کم نہ رہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑا جو کچھ بھی ہو مگر ملک کے مقابلے میں دونوں متحد نظر آئیں۔ اسی نظم میں کہتے ہیں :-

پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں　　اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

اپنی نظم "خاک ہند" میں ہندوستان کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو — سرمدنے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

چکبست کی بے تعصبی کا ایک زبردست ثبوت ان کی وہ نظم ہے جس کا عنوان ہے "آصف الدولہ کا امام باڑہ"۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ چکبست اسلامی تمدن کی قابل قدر یادگاروں کو عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

چکبست ناقوس کے ساتھ اذان اور شوالے کے ساتھ مسجد کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ گوکھلے کے مرثیے میں کہتے ہیں:۔

حدیث قوم بنی تھی تری زباں کے لیے — زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لیے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لیے — کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کے لیے

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

مساوات اور رواداری کی یہ کیفیت بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

مجھے تو چکبست کے سوا کوئی دوسرا شاعر نہیں ملتا جو ناقوس کی فغاں سے بھی متاثر ہو اور کیفیت اذاں سے بھی لطف اٹھائے۔

چکبست فطری شاعر ہیں۔ وہ جب کسی واقعے سے متاثر ہوتے ہیں تو ان کے دل کے تاثرات شعر کے لباس میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی حالت زار پر کڑھتے ہیں، کبھی ہندوستانی سپاہیوں کو پرجوش

الفاظ میں رخصت کرتے ہیں۔کبھی ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ کبھی بزرگان قوم کی وفات کا غم کرتے ہیں۔

چکبست کی نظموں میں ان کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کو متعدد لوگوں کی وفات پر دلی صدمہ ہوا، لیکن نہ یہ سب لوگ ایک طرح کے تھے نہ ان کے انتقال کا غم ایک طرح کا ہو سکتا تھا۔ ان مختلف طرح کے غموں کو اس طرح ظاہر کرنا کہ ان کا فرق نوعیت یا فرق مراتب ظاہر ہو بڑا مشکل کام ہے۔ چکبست نے اس مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ چکبست کے مرثیے شاعری کے وہ کارنامے ہیں کہ اگر حالیؔ کے مرثیۂ غالبؔ کو الگ رکھ دیں تو ان کا جواب کہیں نہ ملے گا۔ چکبست کی شاعری کے محرکات میں سب سے قوی محرک وطن کی محبت ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مرثیوں میں زیادہ تر انھیں بزرگوں کا ماتم کیا ہے جو وطن کی محبت میں سرشار اور وطن کی خدمت کے لیے وقف تھے۔ انسانی اور انفرادی محبت سے بھی کوئی دل خالی نہیں اس لیے چکبست کے مرثیے ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے عزیزوں کی موت پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ یہ مرثیے اس قدر دردناک ہیں کہ پڑھنے والے کو چکبست کے غم میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے جو مصنّف بھی ہیں اور مضمون نگار بھی اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ چکبست کے سب مرثیے ایک سے ہیں۔ اگر مرثیوں کے عنوان چھپا دیے جائیں تو جس مرثیے کو جس کا مرثیہ چاہے سمجھ لو۔ مجھے ان کی اس بے امتیازی پر حیرت ہے۔ میں گو کھلے اور تلک کے مرثیوں میں سے چند شعر پیش کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کوئی صاحب امتیاز گو کھلے کے مرثیے کو تلک کا اور تلک کے مرثیے کو گو کھلے کا قرار دے سکتا ہے؟

گوکھلے کا مرثیہ

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں
چراغ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں

اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لیے
کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کے لیے

تلک کا مرثیہ

مرکر سر دہیے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھا نگہبان وطن دیدۂ عام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

گوکھلے اور تلک ان دونوں بزرگوں کی جو وقعت چکبست کے دل میں تھی وہ ان کی پبلک زندگی اور قومی خدمات کی بنا پر تھی۔ ان دونوں کے مرثیوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے برخلاف لکھنؤ کے نامور بیرسٹر پنڈت بشن نراین در ابر کی پرائیویٹ زندگی سے چکبست بخوبی واقف تھے۔ حضرت ابر عالم، فاضل، انشاپرداز، شاعر، ادیب، نقاد، وطن پرست اور ماہر سیاسیات تھے۔ مگر چکبست ان کے ان کمالات سے کہیں زیادہ ان کے اخلاق اور انسانیت کے گرویدہ تھے

ان کے مرثیے سے بھی یہی بات ظاہر ہو رہی ہے۔
چند بند سنیے :-

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں، دل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا
سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر
وہ نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر
ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

ہے نظر میں تری ہستی کے ستارے کا زوال
وہ شب غم کی سیاہی وہ مرض کا بھونچال
تب بھی سودائے وطن تھا ترے جینے کا مآل
خوف کہتے ہیں کسے موت کا آیا نہ خیال
کاہش تن سے طبیعت کی جلا کم نہ ہوئی
روشنی شمع کی گھلنے سے ذرا کم نہ ہوئی

روشِ عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا
جوہر خاص کا ہستی سے طلب گار رہا
گو کہ جنجال میں دنیا کے گرفتار رہا
اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہشیار رہا
رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صلا
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلا
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جلا
تو زمانے سے مرنو کی طرح جھک کے ملا
عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دل محبت پہ فدا آنکھ مروّت سے غنی ۔۔۔ تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہو اگر نیش زنی ۔۔۔ پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی
شیرِ نر معرکۂ عام کی سرگرمی میں
طفلِ معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

جن مرثیوں کے اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں وہ قوم کے بزرگوں کی وفات پر کہے گئے تھے۔ چکبست نے اپنے نوجوان عزیزوں کے انتقال پر بھی مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں عظمت کا اعتراف تھا ان میں محبت کا اظہار ہے۔ ایک مرثیے کے تین بند سنیے :-

اے جوانی کے مسافر، اے اجل کے میہماں ۔۔۔ سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ چتون سے عیاں ۔۔۔ نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیتِ خواب گراں
کار دنیا سے کوئی یوں بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولھا بھی یوں سوتا نہیں

محفل احباب میں ماتم ہے، تو ہے مست خواب ۔۔۔ کچھ خبر ہے آج کس کس کی ہوئی مٹی خراب
آخری تسلیم کے مشتاق ہیں کچھ دے جواب ۔۔۔ پھر نظر آئے گی کاہے کو یہ تصویرِ شباب
ہنس کے ہر اک بات پر وہ جنبشِ ابرو کہاں
اک نظر پھر دیکھ لے اب ہم کہاں اور تو کہاں

اس دل ناشاد میں کچھ حسرتوں کے ہیں مزار ۔۔۔ اور اک چھوٹی سی تربت ہوگی تیری یادگار
پھول جب گلزار میں لائیں گے پیغام بہار ۔۔۔ یاد کر کے تجھ کو یوں روئے گا تیرا سوگوار
کھل کے گل کچھ تو بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ان مرثیوں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسمی چیزیں نہیں ہیں۔

بلکہ ایک حقیقی شاعر کے دلی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔
چکبست دورِ جدید کے آدمی تھے۔ زندگی کی ہر روش میں سیاسیات کے ہر شعبے میں مناسب تغیر کے خواہش مند تھے مگر کسی قدیم چیز سے صرف اس کی قدامت کی بنا پر بے زار نہ تھے۔ اس لیے ان کے مجموعۂ کلام میں بہت سی غزلیں بھی شامل ہیں مگر ان کی غزل کا انداز سب سے الگ ہے۔ وہ زیادہ تر اخلاقی مضامین باندھتے ہیں عشق و محبت کا بیان بھی ہوتا ہے، مگر محبت کس کی؟ ملک کی، قوم کی، بنی نوع کی، حسن فطرت کی، یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں رقیب سے رشک و رقابت اور معشوق کے ظلم و ستم کا ذکر مطلق نہیں ہے۔ یاس و حرماں، بے ثباتی دنیا، قناعت و توکّل کا بیان بھی ان کی غزلوں میں بہت کم ہے۔ ان کی غزلیں بھی ان کی نظموں کی طرح قومیت اور وطنیت کے جذبات سے مملو ہیں۔ مختصر یہ کہ جو مضامین بالعموم غزلوں میں ہوتے ہیں بلکہ غزل کی جان سمجھے جاتے ہیں وہ چکبست کے یہاں بہت کم ہیں اور جو مضامین قدیم غزلوں میں نہیں ملتے ان کی ان کے یہاں کثرت ہے۔ اس صورت میں یہ صرف چکبست کے اندازِ بیان کا اعجاز ہے کہ ان کی غزل غزل معلوم ہوتی ہے۔ چکبست کی غزلوں کے چند شعر سنیے:۔

مٹی ہیں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

دل کیے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حُبّ قومی بن گیا نقشِ سلیمانی مجھے

روشن دل ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہ تاب ہے اجڑے ہوئے گھر میں

جنونِ حُبّ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہے ابھی مانگ لے وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

چراغِ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

خدمت انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینے پہ اُلفت کی جِلا کرتے رہے

خاک وطن میں دامن مادر کا چین ہے
تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں میری

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خار تمنا کی
دل حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا

دل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی درست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے

دفتر حسن پہ مُہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

رفتہ رفتہ یہ بڑھا جلوۂ تاثیر بہار
سبز پوشان چمن بن گئے تصویر بہار

زندگی نام تھا جس کا اسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پُتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طُرۂ دستار غریباں ہونا

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں
ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

یاد احباب گزشتہ پہ فدا رہتا ہے
دل ناشاد بجھی شمع کا پروانہ ہے

ایسے شعروں کو دیکھنے کے بعد غزل سے بے زاری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ آج کل غزل پر بحیثیت غزل جو اعتراض کیے جاتے ہیں چکبست کی غزلیں گویا ان سب کا جواب ہیں۔

چکبست نے منظر نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ ان کے مجموعۂ کلام

میں صرف ایک نظم " سیر دہرہ دون " ایسی ہے جس میں قدرتی مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ مگر اس نظم میں حسن فطرت سے شاعر کے متاثر ہونے کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ اردو شاعروں کے یہاں نایاب ہے۔ انسانی حسن اور اس کے تاثرات کو تو بہت سے شاعروں نے خوب خوب بیان کیا ہے لیکن حسن فطرت کی دل کشیوں کا بیان چکبست کی اس نظم سے بہتر ملنا مشکل ہے۔ صرف یہی ایک نظم چکبست کے اس شعر کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے:-

یہ ماتم ہے مصور اٹھ گیا گلزار قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگ چمن ہے نوحہ خواں میرا

عالی جناب سر تیج بہادر صاحب سپرو جو ہماری خوش قسمتی سے اس بزم کے صدر ہیں آپ نے صبح وطن کے دیباچے میں بالکل درست فرمایا ہے کہ "چکبست کا ادبی مذاق خاص الخاص لکھنوی ہے"۔ لفظوں کی سبکی اور گرانی، سختی اور نرمی، سوقیت اور ثقاہت، ان کی صوتی اور معنوی صحت، محاوروں کی درستی اور ان کا برمحل استعمال، مترادفات کا نازک فرق، عروضی اور صرفی ونحوی قواعد کی پابندی، ان سب چیزوں کا لحاظ رکھنا لکھنؤ کی شاعری کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت چکبست کے یہاں پورے طور پر موجود ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ وہ خود اہل زبان تھے۔ اہل زبان اور اہل ادب کے ہم نشین تھے انھوں نے آتش اور انیس کے سے ماہر صناعوں کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کے اسلوب بیان کے دل دادہ تھے۔ اس موقع پر ایک غلط فہمی کو دور کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ جب چکبست کے کلام میں انیس کا اسلوب بیان دیکھتے ہیں، ان کی نظم رامائن کا ایک سین میں انیس کے مرثیوں کی رخصت کا انداز پاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ انیس کی طرح چکبست نے بھی اپنے شاعرانہ

خیالات کے اظہار کا ذریعہ زیادہ تر مسدس کو بنایا ہے تو وہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ چکبست میں ذاتی کمال نہ تھا بلکہ وہ انیسؔ کے نقّال تھے۔ ان کم فہموں کو کون سمجھائے کہ کسی کامل الفن کی اس کے فن میں نقل کر لینا خود کمال کی دلیل ہے۔ تاج محل کی سنگ تراشی کو دیکھ کر کوئی پتھر کے ویسے ہی بیل بوٹے بنانے لگے تو کیا وہ ماہر سنگ تراش نہ ٹھہرے گا۔ شکسپیر کے ڈرامے پڑھ کر کوئی ویسے ہی ڈرامے لکھنے لگے تو کیا وہ کامل تمثیل نگار نہ قرار پائے گا۔ فنون لطیفہ میں کامل کی نقل کے لیے بھی کمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر چکبستؔ انیسؔ کی نقل کرتے بھی ہیں تو صرف انداز بیان میں خیالات وجذبات ہمیشہ اپنے رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی ہر نظم سے مل سکتا ہے۔

اردو کی قدیم شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں الفاظ کی صناعی کا کمال موجود ہے مگر نفس مضمون کچھ بھی نہیں۔ جدید شاعری میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں نفس مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعری کی روح جو الفاظ کی صنّاعی کا نتیجہ ہوتی ہے معدوم ہے۔ لیکن چکبستؔ کا کلام قدیم اور جدید دونوں طرح کی شاعری کے محاسن کا مجموعہ ہے۔ ان کی زبان فصیح، بیان دل کش، مضامین بلند اور خیالات عالی ہیں۔ چکبستؔ کے تمام کلام میں متانت، وقار اور بلند اخلاقی موجود ہے۔ کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سنجیدگی سے دور ہو۔ جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ بھی ہو۔ ایک مبصر نے سچ کہا ہے کہ

"جو شعرا اردو شاعری کو ارتقائے قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں ان میں چکبستؔ سب سے آگے ہیں۔"

تمدّن

(مولانا عبدالماجد دریا بادی)

تمدّن کا لفظ بھی مثل دیگر فلسفیانہ اصطلاحات کے ایک کثیر المعنی لفظ ہے۔کسی مقام پر اس کے معنی مطلق انسانی ترقی کے ہوتے ہیں اور کہیں اس سے مراد انسانی ترقی کی چند متعین صورتوں سے ہوتی ہے۔بعض موقع پر ہم ہر ایسے ملک کو جہاں کے باشندے نسبتاً زیادہ شریف زیادہ شائستہ زیادہ عاقل ہوتے ہیں اور جن کے قدم شاہ راہ ترقی پر بہت آگے بڑھ چکے ہیں متمدن کہنے لگتے ہیں، تو ایک مفہوم تمدن کا یہ ہوا۔ دوسرے مفہوم کے لحاظ سے تمدن محض اس نوعیت کی ترقی کا نام ہے جو ایک قومی دولت مند قوم کو وحشی قبائل سے ممتاز کرتی ہے۔تمدن کے معائب و نقائص پر بحث کی جاتی ہے تو اس حالت میں اس کے موخر الذکر معنی ہی سے بحث کی جاتی ہے اور اس لیے اکثر یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے کہ آیا تمدن بہ حیثیت مجموعی رحمت ہے یا عذاب؟ بربادکن ہے یا راحت رساں؟ اس سوال کے جواب میں ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بلا شبہہ تمدّن ایک رحمت ہے۔راحت رسانی کے ذرائع کا سبب ہے اور کسی نفع کا منافی نہیں۔ با ایں ہمہ میرا خیال ہے کہ اعلیٰ قسم کے محاسن کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن کو موجودہ تمدّن مہیّا نہیں کرتا بلکہ

بعض تو ایسے بھی ہیں جن کے لیے موجودہ تمدن ایک حد تک سنگ راہ کا کام دیتا ہے، گو اس مخالف کا رفع ہوجانا ممکن ہے۔

مضمون ہذا میں بھی تمدن پر بحث موخرالذکر معنی کے لحاظ سے ہوگی۔اس موقع پر تمدن عام ترقی کا مرادف نہیں بلکہ اس سے وحشت اور جہالت کی ضد مراد ہے۔جو امور لازمۂ جہالت ہیں، جو وحشیانہ حالت کی خصوصیات اڈلیہ میں داخل ہیں، ان کا ترک اور ان کے بالکل مخالف طرز عمل اختیار کرنا اسی کا نام تمدن ہے۔ مثال کے لیے طرز بود و باش کو دیکھو۔ایک وحشی قبیلہ عبارت ہے ان چند افراد کے مجموعہ سے جو ایک وسیع خطۂ ارض پر خانہ بدوش گھوما کرتے ہیں یا اگر کہیں سکونت پذیر بھی ہوتے ہیں تو دور دور اور دوسرے سے الگ تھلگ۔ ہم اس جماعت کو متمدن کہتے ہیں جن کے افراد کی آبادی اجتماعی ہوتی ہے اور جو باہم موافقت واتحاد پیدا کرکے قصبات اور شہروں میں مکانات بناکر مستقل طور پر اقامت پذیر ہوتے ہیں۔ تمدن اور جہالت کا یہ تضاد معاشرت کے رنگ میں جلوہ نما ہے۔غور کرو کہ وحشی قبائل میں نہ تجارت کا وجود ہوتا ہے نہ صنعت وحرفت کا اور نہ برائے نام کسب و زراعت کا؛ بخلاف اس کے متمدن ممالک میں یہ کاروبار نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوتے ہیں وحشی قبائل کے افراد اپنی زندگی متفرق طور سے بسر کرتے ہیں۔ان میں بجز حالت جنگ کے اور کسی وقت اتحاد باہمی کا وجود نہیں ہوتا اور نہ ان کو باہمی موانست میں کچھ زیادہ لطف آتا ہے۔متمدن ممالک کی کیفیت

اس کے بالکل متضاد ہوتی ہے۔ وہاں جس قدر کاروبار چلتے ہیں وہ عموماً اشتراک و معاونت سے اور باہمی ارتباط اور راہ و رسم کے وسائل سے لطف انگیز ہوتے ہیں۔ وحشی قبائل میں تعزیر جرائم کا کوئی مستقل محکمہ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی قانون ہوتا ہے اور نہ کوئی داد خواہی کا طریقہ۔ ہر فرد اپنی ہی قوت و ہوشیاری کے اعتماد پر خصم سے انتقام لے لیتا ہے لیکن اگر مجرم زیادہ قوی ہے تو مستغیث کی فریاد رسی کی کوئی صورت نہیں۔ متمدن ممالک میں اس کے برعکس عمل درآمد ہوتا ہے وہاں قوانین اور تعزیرات کے ارتباط سے قطع نظر کرکے مجرم کی سزا دہی افراد سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذمہ دار سوسائٹی ہوتی ہے۔ وہاں ہیئت اجتماعی کا نظام ہی ایسا ہوتا ہے کہ جان و مال کی حفاظت اور ان کے اتلاف پر انتقام کا فرض بجائے افراد سوسائٹی پر ہوتا ہے۔

تمدن کا مفہوم اب غالباً واضح ہو گیا ہوگا۔ تمدن کے یہ اجزائے ترکیبی اگرچہ بظاہر باہم دگر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ان کا وجود اور نشو و نما ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوا۔ کیا یورپ اور خصوصاً گریٹ برٹن میں یہ آج عناصر تمدن بہ ہمہ وجوہ پائے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ تمدن کے کیا اثرات اب تک مرتّب ہو چکے ہیں اور آیندہ کن کے ہونے کی توقّع ہے؟

تمدن کی رفتار کا سب سے اہم اور نمایاں اثر یہ ہے کہ:۔
"طاقت افراد کے ہاتھ سے نکل کر بڑی جماعت کے قبضے میں اور چھوٹی جماعت سے نکل کر بڑی جماعت کے ہاتھ میں جا رہی ہے اور جوں جوں جماعتوں کی قوت ترقی کرتی جاتی ہے افراد کی طاقت روز بروز تنزل پذیر ہو رہی ہے۔"
اس کلیہ کے اسباب شواہد اور نتائج قابل غور ہیں جو آگے بیان کئے جاتے ہیں۔

نوع انسان میں اثر اور ہمت حاصل کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں ایک دولت دوسرے قوائے دماغی اور یہ دونوں چیزیں ہیئت اجماعی کے دور اولین میں معدودے چند افراد کے قبضہ و تصرّف میں ہوتی ہیں، اس زمانہ میں عام طبقہ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی جس کی صریح وجہ یہ ہے کہ دولت اور علم دونوں ایک خاص قلیل طبقہ میں محدود ہوتے ہیں اور پبلک بجز ایک نہایت جزئی صورت کے ان سے مستفید نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں اگر پبلک کی رسائی ان چیزوں تک ہوتی بھی ہے تو چونکہ اس کے افراد میں اشتراک و اتحاد کا مادہ ہی نہیں ہوتا "ذی اقتدار جماعت کے مقابلے میں ہمیشہ اس کو ناکامی ہوتی ہے۔

آج دنیا کی ادنیٰ اقوام کا مشاہدہ بتا رہا ہے کہ یورپ کی گذشتہ تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ عہد جہالت میں دولت ایک فرد واحد یا چند افراد کے قبضے میں ہوتی ہے باقی تمام لوگ (بہ استثنائے چند) ایک ادنیٰ زندگی بسر کرتے ہیں جن کے پاس نہ دولت

ہوتی ہے نہ جائداد اور جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں آقا کی خواہشات جائز وناجائز اور اعتبار کی مشق و ستم کا ہدف بنالیں۔ تاریخ کے کسی قرن میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبقۂ متوسط کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عہد جہالت میں یہ طبقہ کیا بہ لحاظ شمار افراد کیا بہ لحاظ قوت نہایت ہی پست حالت میں ہوتا ہے اور اس زمانہ میں مزدوری پیشہ گروہ جو سخت ترین مشقت جسمانی میں مشغول رہتا ہے اور جو باوجود اس محنت شاقہ کے بہ مشکل حوائج زندگی حاصل کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ کس قدر تنگی کے ساتھ معاشرت قائم رکھ سکے گا۔ ہیئت اجماعی کے اس دور میں عوام کی حالت نہایت تنگ دستی اور افلاس کی ہوتی ہے اور ان کے برعکس معدودے چند افراد کو جن کے پائے اقتدار کے لیے نہ کوئی حکومت حلقۂ زنجیر کا کام دیتی ہے اور نہ کوئی قانون کی غیر محدود قوت حاصل ہوتی ہے۔

ان سوالات کا جواب کہ زراعت پیشہ گروہ اور اہل حرفہ نے کیوں کر تدریجی ترقی کی اور اس ترقی سے ملک کی تمدنی زندگی، رسم و رواج، اوضاع و اطوار، خیالات و عقائد وغیرہ پر کیا اثر پڑا تو مورخ کا قلم بتادے گا۔ ہم اس موقع پر صرف طبقۂ متوسط کے نمو کی جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ مختصر فقرہ کس قدر وسیع تشریح کا محتاج ہے۔ پہلے ان امور پر غور کرو کہ تمام متمدن ممالک میں اس طبقے نے دولت وثروت کے لحاظ سے عہد بہ عہد کیوں کر نشوونما حاصل کیا ہے اور مزدوری پیشہ

گروہ نے آج اپنی محنت کے معاوضہ کی شرح میں کتنا حیرت انگیز اضافہ کر لیا ہے۔ پھر فیصلہ کرو کہ کیا ایسے غیر معمولی اسباب سے ایسے غیر معمولی نتائج کی توقع رکھنا بے جا تھا؟ کم از کم اتنا تو بدیہی ہے کہ جہاں تمدن کی رفتار ترقی کے ساتھ ایک طرف دولت کی تقسیم اور علم کی اشاعت عوام میں بڑھتی جاتی ہے، وہاں دوسری طرف یہ نتیجہ بھی ظہور پذیر ہوتا جاتا ہے کہ افراد کی اہمیت بھی جو مذکورۂ بالا ہر دو قوتوں سے بہرہ اندوز ہیں روز بروز گھٹتی جاتی ہے بجائے اس کے پبلک کی قوت یا جمہوریت ہر شعبۂ زندگی میں مسلط ہوتی جاتی ہے بہ شرطیکہ شاہ راہ ترقی پر پبلک کی قوت اشتراک رفتار تمدن کے ہم عناں رہ سکے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ "اب تک یہ ہوتا آیا ہے" اس سوال کا جواب نفی میں کون دے سکتا ہے؟ در حقیقت ترقیِ تمدن کا معیار، اشتراک و معاونت کی قابلیت سے بڑھ کر نہیں۔

اس مزید توضیح کے لیے وحشی قبائل کی حالت پر غور کرو۔ ان کے افراد میں نہ تو جسمانی طاقت کی کمی ہوتی ہے اور نہ ہمت اور جرأت کی اور نہ ذہن و ذکاوت کی۔ پھر آخر یہ لوگ متمدن اقوام کے مقابلے میں کیوں ضعیف و ذلیل رہتے ہیں؟ اس کی وہی وجہ ہے جس کے باعث بہائم اور خوف ناک درندے نوع انسان پر غالب نہ آسکے اور وہ کیا ہے؟ اتحاد، اعانت باہمی کا وجود نہ تھا اور متمدن اقوام کی فلاح کا اصلی راز اشتراک و معاونت کی صلاحیت و استعداد ہے۔ اگر تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر معاونت

کی تہ میں ایثار نفس کا وجود ہوتا ہے، اس لیے کہ جب تک ہر شخص ایک مشترک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی انفرادی خواہشات، اپنی ذاتی اغراض کو ایک حد تک نہ دبائے گا اس وقت تک کسی کی اجتماعی کوشش کام یاب نہ ہو سکے گی لیکن، ایک وحشی میں اس قدر دور اندیشی اور اس قدر ضبط و تحمل کہاں کہ اپنی شخصی خواہشات کو اجتماعی ضروریات کے مطیع رکھ سکے ؛ اب ایک غلام کی حالت پر نظر غور کرو۔ بلا شبہہ اس کو شروع ہی سے ایثار نفس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی ذاتی قوت ارادی معدوم کر دی جاتی ہے اور اس کو دوسرے کے مقابلے میں ضبط نفس و فرماں برداری کا خوگر کیا جاتا ہے لیکن یہ سوال ہے کہ کس کے مقابلے میں ؟ محض اپنے آقا کی تعمیل احکام کے لیے نہ کہ کسی مشترکہ غرض کی انجام دہی کے واسطے جس میں درحقیقت اسی کا نفع ہوتا ہے اگرچہ وہ فوری ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کی اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ ایسے مقصد کا تصور کر سکے اور اگر اتنی عقل ہو بھی تاہم اس میں عمل کرنے کی قابلیت مفقود ہوتی ہے، بے شبہہ اس کو ضبط کی تعلیم دی گئی ہے لیکن ضبط نفس کی نہیں۔

مذکورۂ بالا مثالوں سے غرض یہ ہے کہ جو قومیں جس قدر زیادہ وحشیوں اور غلاموں سے مشابہ ہوں گی، اسی نسبت سے ان میں اتحاد و معاونت کی ناقابلیت موجود ہوگی۔ وحشیوں کے نزدیک اہم ترین فرض جنگ کا ہوتا ہے لیکن وہاں بھی دیکھو کہ ان کا کیا حال ہوتا ہے ؟ وہ ایک تعداد کثیر میں حملہ آور ہوتے

ہیں اور متمدن فوج کی ایک قلیل جماعت سے شکست کھا جاتے ہیں۔ یہ کیوں ؟ محض اس لیے کہ معرکۂ جنگ میں قواعد ذاتی کا ایک لازمی جزو ہی معاونت کا خیال ہے جس کا وجود وحشی قبائل میں سرے سے نہیں پایا جاتا ہے۔ متمدن فوج کا ایک ایک سپاہی بہ نسبت کثرت اعداد کے زیادہ مؤثر و مفید ہوتا ہے لیکن قواعد ذاتی میں اپنے ساتھیوں اور اپنے ملک کی حمایت کا خیال موجود ہوتا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے افسروں اور ساتھیوں کی صلاح نیک ماننے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔ برخلاف اس کے وحشی قبائل کا ہر فرد بجائے خود یہ چاہتا ہے کہ فتح کا سہرا اسی کے سر بندھے۔ وہ دوسروں کے مشورہ پر عمل کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے، اپنے افسروں کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا اور فن حرب کے کسی اصول پر پابندی ضروری نہیں سمجھتا۔ نپولین کے خلاف اپنی حریت برقرار رکھنے کے لیے تمام اسپین نے علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن آخرکار جو ہزیمت اٹھائی وہ اسی کلیہ کی عملی تفسیر ہے۔ قیاس ہوتا ہوگا کہ وحشیوں کے دل میں ایک بیرونی دشمن کی مدافعت کے لیے باہمی اتحاد کی ضرور خواہش ہوئی ہوگی لیکن واقعات سے اس قیاس کی بھی تائید نہیں ہوتی، رومن قوم نے اپنے زمانۂ عروج میں اقوام عالم کو ایک ایک کرکے مسخّر کرلیا اور یہ جاہل قومیں ایک مشترکہ دشمن سے بچاؤ کے لیے آپس میں اتحاد نہ کرسکیں۔ تاریخ میں اور دوسری جاہل قوموں کا ذکر

موجود ہے جو متمدن حملہ آور قوم کے مقابلہ میں اتحاد باہمی پیدا نہ کر سکیں۔ غرض غیر متمدن اقوام نے جب اجتماعی حیثیت سے کوئی کام کرنا چاہا ہے تو ناکامی سے سامنا ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ اشتراک و معاونت کی ناقابلیت قوموں سے کیوں کر دور ہوجاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر دشوار امر میں ناکامیابی مشق کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اس دقیق چیز میں مہارت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابتداءً اس کی مشق اسی نوعیت کی آسان چیزوں پر کی جائے۔ ہم جس شے کو انتہائی تمدن سمجھ رہے ہیں وہ ایسے ہی مسلسل اور متواتر عملوں کا نتیجہ ہے۔ انتہائی جہالت کے زمانے میں کسی قسم کے اتحاد کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنا کام الگ الگ کیا کرتا ہے۔ اگر کسی حاکم کی خدمت چند لوگ یک جا ہو کر کریں گے تو بھی ایک دوسرے سے بے واسطہ بلا تعلق، مزدور محض اپنا بوجھ اٹھانے سے سروکار رکھے گا۔ کاشت کار کی توجہ صرف کھیت پر رہے گی۔ اس بے تعلقی کی حالت میں اتحاد کا خیال پیدا ہونا غیر ممکن ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر جب انسان کو ایسے کاموں سے سابقہ پڑتا ہے جس کی انجام دہی کے لیے چند لوگوں کی مشترکہ محنت درکار ہوتی ہے، تب معاونت کا خیال پیدا ہونے لگتا ہے۔ گویا معاونت کا سبق تقسیم عمل کی درس گاہ میں ملتا ہے مثلاً فن جہاز رانی میں جہاں کل کام کرنے والوں کی مشترکہ محنت کی حاجت ہوتی ہے

کپتان، خلاصی، ملاح وغیرہ ان میں سے اگر ایک شخص بھی اپنے کام میں غفلت کرے تو سارے جہاز کی بربادی کا اندیشہ ہے۔ ایسے ہی مواقع پر انسان کو اشتراک و معاونت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہیں سے اس کی قدر معلوم ہونے لگتی ہے۔اس وقت سے اس کے سامنے جتنے کام آتے ہیں وہ اس کو مشارکت ہی سے انجام دیتا ہے فن حرب و صنعت و حرفت وغیرہ میں اس کو اسی کی مشق ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اوج تمدن تک پہنچتے پہنچتے وہ رفتہ رفتہ اس کا بالکل عادی ہو جاتا ہے۔

کہکشاں کا ایک سانحہ

(نیاز فتح پوری)

ہاں اگر کہکشاں اور ملکۂ کہکشاں[1] پر آسمان کی تمام دوسری سلطنتوں اور فرماں رواؤں کو رشک تھا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ کہکشاں سے زیادہ شاداب، کہکشاں سے زیادہ حسین ملک۔ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ہوا کے معلّق ملکوں میں کوئی اور نہ تھا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جسے قدرت نے پھولوں میں بھی یاسمین ونیلوفر کی پیداوار کے لیے مخصوص کردیا تھا اور اس میں کلام نہیں کہ اگر یہاں کی فرماں روا ہستی کبھی چند دنوں کے لیے خاص اسباب یا مصلحت کی بنا پر اپنے ہاں کی اس متبسم وخنداں پیداوار کی برآمد دوسرے ممالک کے لیے بند کردیتی تو سارا آسمان اور آسمان کے تمام دوسرے ملک چیخ اٹھتے۔ محافل طرب سنسان ہو جاتیں اور اتنے دنوں کے لیے تمام مراسم تہنیت ومسرت مسدود، کیوں کہ آسمانی مخلوق میں اظہار شادمانی ونشر طرب کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہر شخص پھولوں کے ساتھ ہنسے اور کلیوں کے ساتھ مسکرائے۔ ہاں اتنے دنوں کے لیے نیند مفقود ہوجاتی اور معابد ویران کیوں کہ آسمانی بستیوں میں سو جانا صرف

یہی تھا کہ پھولوں کی بیدار شگفتگیوں میں راتیں بسر کردی جائیں اور وہاں کی پرستش کچھ نہ تھی مگر یہ کہ پھولوں کو سونگھ کر معابد کی کنواری لڑکیاں بے ہوش ہوجائیں۔

کہکشاں کا دوسرا نام بلدۃ النساء بھی تھا، کیوں کہ یہاں کی آبادی عورتوں اور صرف عورتوں ہی کی تھی اور جب دوسرے ملکوں کے مردوں کو ضرورت ہوتی کہ وہ یہاں کی لڑکیاں حاصل کریں تو وہ اپنی التجاؤں کو جنھیں وہ صرف آہ کی صورت میں شہاب ثاقب کے ذریعہ سے پہنچا سکتے تھے، ملکۂ کہکشاں کے سامنے پیش کیا کرتے اور اسے اختیار ہوتا کہ اس مرد کی تمام حیثیات کو دیکھ کر ایک لڑکی منتخب کرے اور کثیر دولت کے عوض میں جو زیادہ تر موتیوں اور جواہرات[ا] کی صورت میں قبول کی جاتی، اس کے پاس کسی رات اس حال میں کہ وہ اپنے بستر پر انتظار میں کروٹیں لیتا کچھ غافل سا ہوگیا ہو دفعتہً پہنچا دے۔ پہلے چند دنوں تک تو یہی دستور جاری رہا کہ لڑکیاں دوسرے ملک میں اسی طرح بھیج دی جاتیں اور پھر واپس نہ آسکتی تھیں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کہکشاں کی لڑکیاں دوسرے ملک میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتیں تو پھر ملکۂ کہکشاں نے لڑکیوں کو باہر بھیجنا قریب قریب بند کردیا اور بجائے اس کے کہ لڑکیاں باہر بھیجی جائیں، مردوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مطلوبہ کے

ا۔ جوہر، گوہر کا معرّب ہے، اس کی جمع عربی قاعدے سے جواہر اور جواہر سے جواہرات بنائی گئی ہے۔

پاس مہینہ میں ایک دن رات آکر یہیں بسر کر لیا کریں۔ ہر چند کہکشاں کے آئین سلطنت و نظام مملکت کے خلاف تھا کہ کوئی مرد یہاں آکر ایک رات بھی گزار سکے لیکن ملکہ نے مجبوراً یہ معلوم کر کے کہ اس کے ملک کا بہترین حسن باہر جاکر فنا ہوجاتا ہے، اپنے قانون میں تھوڑی تبدیلی کو گوارا کیا اور اس طرح مردوں کی آمد و رفت کہکشاں میں شروع ہوگئی۔ اگر اس مواصلت "یک شب بہ ماہے" کا نتیجہ اولاد نرینہ کی صورت میں ظاہر ہوتا تو مرد مجبور کیا جاتا کہ اسے اپنے ملک میں لے جائے اور اگر لڑکی ہوتی تو یہیں رکھ لی جاتی اور مرد کو بالکل اختیار نہ ہوتا کہ وہ کبھی اس کے لے جانے کی خواہش کرے۔ الغرض کچھ اسی قسم کا نظام مملکت کہکشاں کا اس وقت تھا جب کہ "ملکہ لالہ رخ" وہاں حکم راں تھی۔

یہ ملکہ کچھ تو اس دولت پر مغرور ہوکر جو بے اندازہ و بے شمار اس کی سلطنت میں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آتی تھی اور کچھ اس خشونت مزاج کی بنا پر جو اس کی فطرت تھی ہر وقت چیں بجبیں نظر آتی اور یہ بات تمام جوِ سماء[1] میں اس قدر مشہور ہوگئی تھی کہ مردوں کو اپنی التجائیں پیش کرتے خوف معلوم ہوتا تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ اس نے، اگر وہ کسی وقت خوش نہ ہوئی، ان درخواستوں کو بغیر سمجھے ہوئے رد کر دیا اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی تاسف نہ کیا۔ تاہم اسے مردوں سے نفرت نہ تھی اور یہ جذبہ ابھی اس کے دل میں

---

[1] فضائے آسمانی

پیدا نہ ہوا تھا کہ ایک رات جب کہ وہ کسی تاثر سے مغلوب و ملول تھی، اس کا شوہر ملک عطارد کا بادشاہ آیا اور وہ اس طرح کچھ مسرور سی نظر آنے لگی۔ لیکن آدھی رات گزر جانے کے بعد جب لالہ رخ نے اسے لیٹ جانے پر مجبور کیا اور اس نے نہیں سنا کیوں کہ وہ اشعۂ نکہت پر اپنے جدید تجربات کو جو اسی دن حاصل ہوئے تھے جلدی جلدی لکھ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جائے تو اس کو مردوں سے نفرت بھی ہو گئی اور اسی واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کی آمد و رفت اس نے بالکل بند کر دی اور رسم مناکحت قاطبۃً مسدود۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں وہی زمانہ تھا جب لالہ رخ کے سامنے یا کہکشاں کے ملک میں کہیں اور مرد کا نام لینا بھی سخت جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے حکم دے دیا تھا کہ اس کے دربار میں، اس کے ملک میں کسی جگہ مرد کا ذکر بھی نہ کیا جائے اور مرد کی اس خود غرض جنس کو جو عورت نہ ملے تو یکسر اضطراب و اضطرار رہے اور اگر مل جائے تو سراپا غفلت و پندار، بالکل بھلا دیا جائے کہ اب یہ جنس پیدا ہونا ہی بند ہو گئی ہے۔

جس وقت ملکۂ کہکشاں نے یہ اعلان اپنے ملک میں شائع کیا اس وقت اس کی لڑکی ریحانہ کی عمر صرف دو سال کی تھی اور اس لیے اس کا نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوا جب مرد کا وجود کہکشاں میں مفقود تھا اور اس کا ذکر ممنوع۔ اس اعلان کو پندرہ سال ہو گئے اور لالہ رخ نے باوجود

اس کے کہ تمام سلطنتوں نے اپنے آہ و شیون سے سارا آسمان سر پر اٹھا لیا اپنے ارادہ کو بالکل متزلزل نہ ہونے دیا وہ اپنے عہد پر بدستور قائم رہی۔

(۲)

"شاہ زادی ریحانہ" اپنے حسین بالوں کے سیاہ و دراز ریشم کو پیٹھ پر منتشر کئے ہوئے بیاض گردن کی نہ چھپنے والی برق صبیح کی عریانیوں کو ان بادلوں کی آغوش میں چھپائے ہوئے اپنے یاسمین زار شانہ و دوش پر یہ آبشار سنبلیں لیے ہوئے ساحل بحر پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ جب آفتاب سمندر کے اندر سے تازہ تازہ نہا کر نکلتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس کی پذیرائی کس طرح کرتی ہے۔ وہ صبح کی ہلکی ہلکی ہوا میں اس طرح جنبش کھا رہی تھی جیسے ساحل پر ایک سروِ زرّیں جھوم رہا ہو۔ اس کے بالوں کی نرم نرم جنبش ہوا کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چھلوں کا پیٹھ پر گھوم گھوم کر رہ جانا کچھ اس درجہ لطافت پیدا کر رہا تھا کہ انھیں دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ بال ہیں بلکہ وہی ہوا کی ہلکی موجیں ہیں جو ریحانہ کی پشت اور شانہ و دوش کو چھو چھو کر سیاہ ریشمیں لچھوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ ایک چادر جو صرف جوہی کے پھولوں کو گھاس کے تنکوں میں پرو کر اور تنکوں کو باہم ایک دوسرے سے ملا کر تیّار کی گئی تھی اس کے بلور سے شفاف جسم کو لپیٹے ہوئے تھی۔ ہاں وہ اس وقت سفید پھولوں کے اس ملبوس میں جو اس کے جسم پر ایک ہالکے

گلابی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا۔ اپنے خوبصورت جسم، اپنے حسین اعضا کے تناسب کو بغیر اس خواہش کے کہ انھیں پوشیدہ رکھے کسی کی نگاہوں میں ایک حریص جستجو، ایک پر شوق نفوذ کی کیفیت پیدا کرلے، چھائے ہوئے طلوع آفتاب کے نظارے کو اپنی نگاہوں کے مس سے شان دار بنا رہی تھی۔ وہ آفتاب کے ارغوانی چہرہ میں خدا جانے کیا چیز ایسی محسوس کر رہی تھی کہ ٹکٹکی باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کے خاموش منظر میں جب کہ سمندر کی لہریں ضیائے آفتاب کے ٹکڑے کرنے میں ایک طرف خاموشی سے مصروف تھیں، تنہا نہ تھی۔ لیکن اس کی کنیزیں جو دور ایک فاصلہ پر مؤدب کھڑی ہوئی شاہ زادی کی اس محویت کو اپنے اندر سکوت و خاموشی میں تبدیل کئے ہوئے دم بخود کھڑی تھیں کچھ بول نہ سکتی تھیں، کیوں کہ شاہ زادی کے سکوت میں دخل دینا، ریحانہ ایسی جلیل القدر شاہ زادی کے انہماک میں بات کرنا خلاف تہذیب تھا۔ وہ جنبش نہ کر سکتی تھیں، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ جب ریحانہ کا جسم کسی خاص وجہ سے حرکت کو قبول نہ کرے تو انھیں بھی اپنی اپنی ہستیوں کو مجسمہ بنا لینا چاہیئے اس وقت تک کہ ریحانہ خود ہی اپنے چشم سامری فن کے اشارہ سے ان میں جان ڈال کر بولنے کی اجازت نہ مرحمت کرے۔ صنوبر اپنے بربط کو اور سنبل اپنے ارغنوں کو ہاتھ پر لیے ہوئے ریحانہ کے قریب ہی پیچھے کھڑی ہوئی تھیں اور منتظر تھیں کہ شاہ زادی اس طرف مخاطب ہو تو وہ اپنے نغمۂ صباحی کے ہدایائے لطیف

کو پیش کریں لیکن شاہ زادی کی کیفیت وہی قائم رہی، یہاں تک کہ صنوبر و سنبل تھک گئیں اور ان کے نازک ہاتھوں سے ساز چھوٹ کر زمیں پر گر پڑے اور تار کی جھنکار نے ریحانہ کے خیال کو اپنی طرف مائل کیا۔ سنبل و صنوبر دونوں کھڑی کانپ رہی تھیں، گویا التجا کر رہی تھیں کہ اگر ساز کے اندر بلا اجازت آہنگ ارتعاش پیدا ہوگیا ہے تو ہمارے جسموں کی تھر تھری پر رحم کھا اور معاف کردے۔ ہمارے اعضا کی کپکپی کو دیکھ اور سمجھ لے کہ تیرے ساز کے تاروں کا ارتعاش ہم نے ہوا میں نہیں مل جانے دیا، بلکہ اپنے جسم پر طاری کر لیا ہے اور اس طرح ہم مستحق عفو ہیں، صنوبر و سنبل نے چاہا کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا ساز اٹھائیں لیکن ریحانہ نے منع کر دیا اور کہا کہ نہیں اب ان کو یوں ہی پڑا رہنے دو۔ جب ساز سے نغمہ جدا ہو جائے، جب موسیقی تاروں سے برہم ہو کر اپنا التفات ہٹالے تو پھر ساز کا ٹوٹ جانا اور تاروں کا ٹکرے ٹکڑے ہی ہو جانا خوب ہے۔ اے صنوبر تیرا بربط، اور اے سنبل! تیرا ارغنوں پہلے ہی کب میری تسکین تھے کہ اب انھیں پھر درست کر کے میرے کانوں میں خراش اور میرے دل میں اضطراب پیدا کیا جائے گا۔

ریحانہ کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر بنفشہ بڑھی اور دامن کے پھولوں اور کلیوں کا انبار اس کے قدموں پر ڈال کر ادب سے خاموش کھڑی ہوگئی۔ ریحانہ نے سر سے پاؤں تک بنفشہ کو دیکھا اور بولی کہ کیوں تو نے ان نازک مخلوق کو صدمہ

پہنچایا جب کہ ان کی نکہت کی خنکی مجھے مسرور نہیں کرسکتی۔میرا بدن اب سرد ہے۔ میرا خون خود رگوں میں جما جاتا ہے۔تیرے باغ میں کوئی آتشیں پھول نہیں۔ تیرے چمن میں کوئی درخت ایسا نہیں جو اپنی شاخوں سے انگارے پیدا کرے اور تو انھیں لاکر مجھے دے کہ میں انھیں اپنے سینہ سے لگاکر دل کی تپش میں کمی، ہونٹوں سے چھوکر ان کی جنبش میں کچھ سانس کی حرارت محسوس کروں۔ ہاں اے سوسن! تو ہر رات میرے سرہانے بیٹھ کر اپنے افسانوں سے میری پلکوں کو ایک دوسرے سے ملادینے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ چلی جا اور اس وقت تک میری خواب گاہ میں آنے کا ارادہ نہ کر جب تک تو مجھے یہ نہ بتا سکے کہ بلبل ایک پھول کے لیے کیوں سر دھنا کرتی ہے، ایک بھونرا کلی کو اپنی آغوش میں لے لینے کے لیے کیوں اس درجہ بے تاب نظر آتا ہے۔ ایک فاختہ کے سامنے دوسری فاختہ کیا چیز۔مست ہو ہو کر سنایا کرتی ہے، ایک طائر کیوں خوش خوش نظر آیا کرتا ہے جب کہ تم میں سے کسی کی بات اب مجھے پسند نہیں آتی اور نہ کسی کی معیّت مجھے مسرور کرسکتی ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں تم صرف ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتی ہو۔ میں کہتی ہوں جواب دو، تم گردن جھکالیتی ہو۔میں جانتی ہوں کہ تم سب مجھ سے کوئی بات چھپانا چاہتی ہو۔ اچھا تو جاؤ۔سب جاؤ۔

آج میں تنہا سمندر کے اندر لہروں کی آغوش میں اپنی کشتی

سونپ دوں گی اور کوشش کروں گی کہ اس ساحل پر جا کر اگر کوئی ساحل اس طرف ہے، اس ساحل کی اذیتوں کو بھلا دوں۔ کنیزیں منہ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئیں اور ریحانہ جلد قدم اٹھا کر اپنے تئیں کشتی کی آغوش میں اور کشتی کو سمندر کی آغوش میں آزادانہ چھوڑ کر نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

(۳)

آفتاب جو صرف چند ساعتوں کے لیے کہکشاں کی زمین پر چمک کر غائب ہو جاتا تھا تھوڑی دیر میں سمندر کے اندر کہیں غرق ہو گیا اور ریحانہ کے سر پر ہلالوں کے جھرمٹ نے اپنا نورانی سایہ ڈالنا شروع کیا۔ کہکشاں کی مملکت میں پورا چاند کبھی طلوع نہ ہوتا تھا بلکہ وہ اتنے ہلالوں کی صورت میں جتنے کہ ایک پورے چاند سے ہو سکتے ہیں، ایک زنجیر ہلالی کی صورت میں نمودار ہوا کرتا تھا۔ اس وقت سمندر پر سمندر کی موجوں پر ایک سکون طاری تھا اور کوئی ہلکی سی ہلکی آواز بھی علامت حیات کا پتہ دینے والے کانوں میں نہ آتی تھی۔ ریحانہ جس نے اس سے قبل کبھی اپنے تئیں تنہا نہ دیکھا تھا گھبرائی، ڈر گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح واپس جائے اور رات کے اس سنسان منظر سے جو اس پر مستولی ہوتا نظر آ رہا تھا کسی طرح سمٹ کر الگ ہو جائے۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ دفعتاً سمندر کی سطح میں اس نے ایک جنبش محسوس کی اور پانی کے اندر سے نہایت تیز

اور لانبی لانبی شعاعوں کو نکلتے ہوئے اور اس کی کشتی کو چھوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے معلوم کیا کہ ان کا اثر کشتی پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ہاتھ سے اسے ڈھکیلے اور یوں ساحل کی جانب اس نے بڑھنا شروع کیا۔

وہ اس منظر سے جو اس کے لے بالکل عجیب وغریب تھا بہت متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے بالکل بھول گئی کہ یہ شعاعیں اسے کہاں لیے جا رہی ہیں اور کیوں؟ وہ اسی خیال میں مستغرق اور اسی لذت میں سرشار تھی کہ کشتی دفعتہً ساحل سے ٹکرائی اور ریحانہ اس طرح یک بارگی خشکی پر جا پڑی جیسے کسی نے اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس صدمہ سے کتنی دیر بے ہوش وبے حس وحرکت پڑی رہی، لیکن جس وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا سر کسی کی آغوش میں ہے اور اس کے جسم کو کوئی چیز مس کر رہی ہے۔ وہ یہ سمجھی کہ یہ کوئی خواب ہے اور نہایت پر لطف خواب کیوں کہ باوجود رات کی خنک ہواؤں کے وہ اپنے اندر اس آغوش سے گرم گرم شعاعوں کو سرایت کرتی محسوس کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ اسی طرح پڑی رہے اور ہمیشہ اس خواب لطیف کو دیکھتی رہے۔ اسے کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وہ کبھی کبھی یہ معلوم کرتی تھی کہ اس کے لبوں کو کسی چیز نے چھوا۔ اس کے جسم کو مس کیا۔ وہ ہر مس کے ساتھ اپنے

خون کے اندر ایک عجیب پُر مزہ حرارت نفوذ کرتی ہوئی پاتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ چھونے والی چیز، وہ اس کے جسم سے مس ہونے والی کیا شے ہے۔ وہ رات بھر اسی حال میں پڑی رہی اور صبح کو جس وقت آنکھ کھلی تو اس نے رات کی پر مزہ کیفیات کی کوئی علامت اپنے پاس نہ پائی، سوائے ایک تحریر کے جو اس کے بالوں کی ایک لٹ سے بندھی ہوئی تھی اور جسے ریحانہ نے پڑھنا شروع کیا۔

"اے ریحانہ! اے ملکۂ کہکشاں کی بیٹی!!

تجھے خبر نہیں کہ تیرے لیے تجھ سے دور کسی دوسرے ملک میں کیا کیا اضطراب برپا ہے۔ تیرا افسانۂ حسن رات کے تارے مجھے روز سنایا کرتے تھے۔ میں کڑھا کرتا تھا کہ تجھے کس طرح دیکھوں۔ کیوں کر اپنے شوق کو تیرے نازک قدموں پر ڈال کر تجھ سے رحم کی درخواست کروں۔ آج میں نے تجھے دیکھ لیا، آہ! میں نے کیوں دیکھا، میں تجھے کس طرح سمجھاؤں کہ اب میرے شوق کا کیا حال ہے اور میرے اضطراب کا کیا رنگ۔ تیری اتنی عمر جو میری جنس کے ذکر سے ناآشنا ہونے کی حالت میں گزر گئی کیوں کر تجھے سمجھنے دے گی کہ میں کون ہوں اور تیرے لیے کیوں اس قدر بے تاب۔ تو، افسوس ہے کہ جذبۂ محبت سے بالکل بے گانہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بے گانہ رکھی جائے گی، ورنہ تو سمجھتی کہ محبت کیا ہے اور محبت ایک شخص کو کس قدر تڑپا سکتی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے

پاس ہو۔ اور کبھی جدا نہ ہو، بے تاب ہوں کہ تو میرے پہلو میں ہو اور میں تجھے وہ نغمۂ محبت سناؤں جس کے سننے کے لیے تیری ہستی ایک مجہول خلش اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں کر سکتا، کیوں کہ ملکۂ کہکشاں نے مردوں کی آمد و رفت اپنے ملک کے اندر ممنوع اور ان کی التجاؤں کے لیے درِ قبول کو بند کر دیا ہے اور اس طرح اگر اس نے ایک طرف آسمان کے تمام دوسرے ملکوں میں بے چینی پھیلا رکھی ہے تو دوسری طرف خود اس کے ملک میں بھی ایک خاموش ماتم بپا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مرد عورت سے نہ ملے۔ کہکشاں کی کوئی لڑکی کسی مرد کی صورت نہ دیکھ سکے۔ اس لیے میں کہ مرد ہوں کیوں کر خواہش کر سکتا ہوں، تیری، کہ تو عورت ہے؟ آج جب کہ تو ساحل پر کھڑی ہوئی آفتاب کی شعاعوں کو اپنی نگاہیں، اپنے جسم کا لوچ، اپنے بدن کا گداز چومنے کی اجازت دے رہی تھی، میں بھی تجھے اُفق سے دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا جو تو اپنی کنیزوں سے کہہ رہی تھی۔ میں نے تجھے سمندر میں جاتے ہوئے دیکھا اور تڑپ گیا کہ آج شاید وہ وقت آگیا ہے کہ تجھے اپنے شوق کی کہانی سناؤں۔ اپنا فسانۂ محبت تجھ سے بیان کروں۔ شام ہوئی اور میں نے تیری کشتی کو اپنے ہاتھوں پر لے کر ساحل تک پہنچا دیا۔ تو بے ہوش تھی اور میں کہہ رہا تھا جو کچھ مجھے کہنا تھا۔ تو بے حس و حرکت پڑی تھی اور میں بیان کر رہا تھا جو کچھ مجھے بیان کرنا تھا۔

میں نے رات بھر اپنے شوق کی کہانی، اپنے لبوں سے تیرے لبوں کو، اپنے ہاتھ سے تیرے جسم کو سنائی لیکن میں اپنی صورت تجھے نہ دکھا سکا، کیوں کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ ملکۂ لالہ رخ کی اجازت حاصل کئے بغیر اس کے ملک میں میری اور کسی مرد کی صورت تیرے اور کسی عورت کے لیے مرئی نہیں ہو سکتی۔ اب میں جاتا ہوں اور بتائے جاتا ہوں کہ اگر تجھے اب موسیقی میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی، اگر تجھے پھولوں کی خوش بو اب مسرور نہیں کر سکتی، اگر افسانوں میں اب تیری راحت پنہاں نہیں ہے تو حیرت نہ کر کیوں کہ وہ موسیقی جس سے عورت کی جوانی لذت حاصل کر سکتی ہے، صرف نغمۂ عشق ہے۔ وہ خوش بو جو ایک لڑکی کے شباب کو مسرور کر سکتی ہے، صرف نکہت محبت ہے، اور وہ افسانہ جو تیری عمر کی ایک دوشیزہ لڑکی کے لیے راحتیں مہیا کر سکتا ہے وہ صرف افسانۂ پرستاری ہے جو تجھے اب کہکشاں کے ملک میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنی ماں سے پوچھ کہ یہ سب کہاں میسّر آئے گا۔ اگر یہ سن کر وہ تجھ سے برہم ہو جائے تو یقین کر لینا کہ اگر وہ میری دشمن ہے تو کچھ تیری بھی دوست نہیں اور پھر تجھے اختیار ہے چاہے اپنی ماں کے ان مظالم کو اپنے اور میرے لیے قائم رہنے دے، چاہے ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جا جو تیرے لیے اتنا ہی بے قرار ہے جیسے تو ایک نامعلوم شے کے لیے۔"

ریحانہ اس تحریر کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھ بھی نہ چکی تھی کہ اس کی ماں کنیزوں کے ایک ہجوم کے ساتھ دفعتہً آگئی اور

اس کو اپنے گلے سے لگا کر ساتھ لیے ہوئے چل دی۔ ملکۂ کہکشاں اپنے قصر میں خاموش اور متفکر بیٹھی ہوئی سوچ رہی ہے کہ ریحانہ کے دل و دماغ سے اس غم کو کیوں کر دور کر سکے جس کے متعلق وہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ کیوں کر پیدا ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس وقت مرد کا نام بھی ریحانہ کے سامنے کبھی نہیں لیا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ کوئی افسانۂ حسن و محبت ریحانہ کو اس وقت تک نہیں سنایا گیا۔ پھر ریحانہ نے یہ سوال کیوں کیے اور کہاں سے اس کو معلوم ہو گیا کہ مرد اور محبت کا بھی دنیا میں کوئی وجود ہے؟ میں نے بہت پوچھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ وہ کہتی ہے کہ خواب میں اس نے کچھ دیکھا اور سنا ہے اور اس وقت سے اس کے دل میں ایک خاص اضطراب کی کیفیت پیدا ہے۔ مگر خواب دکھانے والا نیند کو آکر بے چین کرنے والا سوائے شہزادۂ قمر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تو کیا میں اپنے عہد پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی؟ کیا میں مجبور ہو جاؤں گی؟ کہ اپنی ریحانہ کو ظالم و خود غرض مرد کے سپرد کر دوں۔ صرف اس لیے کہ جب وہ سیر ہو جائے تو اس کا دل دکھانے لگے، اور جب اس کی خواہشات پوری ہو جائیں تو وہ تنفّر کرنے لگے۔ نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے منظور ہے کہ ریحانہ اس غم میں گھل گھل کر ہلاک ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں مرد، ظالم و خود غرض مرد کی نفس پرستیوں پر اپنی بیٹی یا اپنے ملک کی کسی ایک لڑکی کی قربانی کو جائز رکھوں۔ اس نے اپنی

کنیز سے ریحانہ کو طلب کیا اور کہا کہ:-
"اے ریحانہ! یقیناً مرد کی ایک جنس ہے جو تیری پیدائش سے قبل یہاں آمد و رفت رکھتی تھی اور جس سے ہمارے ملک کی لڑکیاں ملتی جلتی تھیں۔ میں نے ان کی ادائیں پسند نہیں کیں اور ان کا آنا جانا بالکل بند کر دیا اور حکم دے دیا کہ میرے ملک کی لڑکیاں اس کا ذکر بھی نہ کریں، کیوں کہ یہ جنس جس کے لیے تیرے دل میں ایک خلش، ایک جستجو پیدا ہوئی ہے بڑی خود غرض جنس ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ اس کی محبت جھوٹی، اس کے وعدے نااستوار، اس کی باتیں ناقابل اعتبار ہیں۔ وہ بے تاب رہتے ہیں کہ ہماری جنس کا کوئی فرد ان کو مل جائے لیکن صرف اس لیے کہ ہماری شیفتگی کی لذت کچھ دن حاصل کر کے اس کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔ یہ کلی کو کچھ دیر دیکھ کر مل ڈالنے والا طبقہ، یہ پھول کی خوش بو سے چند لمحہ مسرور ہو کر اس کی پنکھڑیاں توڑ کر منتشر کر دینے والا گروہ، اگر اب بھی کسی چمن کے اندر اپنی پذیرائی کرنے والی کلیاں اپنی نمائش و شیفتگی پر مٹ جانے والے پھول رکھتا ہے تو ایک باغ بان کا فرض ہے کہ وہ ان کلیوں، ان پھولوں کو گلبن پر یوں ہی خشک ہو جانے دے اور اس لیے اے ریحانہ! اگر آج میں تیری خواہش پوری کرنے پر راضی نہیں ہوں کہ مرد کا حال تجھ سے بیان کروں یا تیرے کسی شوق کی رعایت ملحوظ رکھ کر اس کی صورت تجھے

دکھاؤں۔ تو مجھے معذور سمجھ کہ میرے چمن ہستی کی کلی صرف تو ہی ایک ہے اور باغ حیات کا پھول صرف ایک تیرا وجود اور اس لئے میں گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ میرے سامنے یوں تباہ و برباد ہو اور میں خاموش دیکھا کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرے دل کے اندر خلش کیوں کر پیدا ہوئی اور وہ کون ہے جو تجھے مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے، لیکن یہ یقین کرلے کہ میں اپنے عزیز سرمایۂ مسرت و راحت کو یوں ارزاں و آسان نہ جانے دوں گی اور اپنی زندگی میں یہ کبھی روا نہ رکھوں گی کہ تجھے خود اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کردوں۔ دیکھ! اے ریحانہ تو ایسی بات کے لیے ملول نہ ہو جو اگر تجھے آج حاصل ہو جائے تو کل اور زیادہ ملول کردے، تو ایسی چیز کے لیے مضطرب نہ ہو کہ اگر وہ تجھے صبح کو میسّر آجائے تو شام کو وہ تیرے اندر اور اضطراب پیدا کردے۔

وہ اپنی تقریر کو ختم بھی نہ کر چکی تھی کہ دفعتًہ دربار کے اندر ایک بقعۂ نور پھیل گیا اور شاہ زادی ریحانہ اس کے اندر وہی شعاعیں دیکھ کر جنھوں نے اس کی کشتی کو ساحل تک پہنچایا تھا مبہوت و متحیّر رہ گئی۔ ملکۂ لالہ رخ نے فوراً سب کو رخصت کر دیا کیوں کہ وہ سمجھ گئی کہ یہ شاہ زادۂ قمر کا پیام ہے جو ریحانہ کے لیے آیا ہے اور اس لیے یہ پیغام سننے اور جواب دینے کے لیے اپنے تئیں مع چند خاص کنیزوں کے کمرے کے اندر بند کر لیا۔

(۴)

ریحانہ پھولوں کے بستر پر پڑی ہوئی اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی

سانسیں، ان کی خوش بو کے ساتھ فضا میں منتشر کر رہی تھی۔ زنجیر ہلالی اس کے سامنے جگمگا رہی تھی اور وہ اپنی نگاہوں میں ان کی برودت سے آنسوؤں کے ننھّے ننھّے موتی بنا بنا کر پلکوں سے ڈھلکا رہی تھی کہ دفعتاً اس کی دایہ آئی اور ریحانہ کو اس قدر مغموم وافسردہ دیکھ کر بے تاب ہو گئی۔ اس کو ریحانہ سے بڑی الفت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے غم کو دور کر سکے۔ اس کے بس میں نہ تھا کہ وہ ملکۂ لالہ رخ کو اس عزم سے ہٹا دے یا ریحانہ کے دل سے اس جذبۂ مہلک کو دور کر سکے۔ ہفتوں گزر گئے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس طرح ریحانہ کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ اس نے اپنے تمام مشاغل تفریح ترک کر دیے اور ساری خواہشیں محو۔ اگر اس کا جی چاہتا تھا تو صرف اس بات کو کہ ایک بار وہ پھر اسی طرح کشتی میں تنہا نکل جائے اور پھر ساحل پر بے ہوش ہو کر اس خواب کو دیکھے جس کی لذّتوں سے وہ اب بھی اپنی ہستی کو لب ریز اور اپنے دل کو مالا مال پاتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکتی تھی کیوں کہ ملکۂ کہکشاں نے سخت ممانعت کر دی تھی اور بغیر اجازت قصر سے باہر قدم بھی نہ نکال سکتی تھی۔ اس غم نے ریحانہ کو بالکل نڈھال اور اس سوگ نے اس کو بالکل بے حال کر رکھا تھا جس کو دیکھ کر اس کی دایہ کڑھتی تھی اور پریشان تھی کہ کیا کرے۔ ایک رات کہ جب ریحانہ کی بے قراریوں کی کچھ انتہا

نہ تھی، اس کی دایہ سے نہ دیکھا گیا اور بولی کہ:۔

اے ریحانہ! بتا میں کیا کروں؟ میں آمادہ ہوں کہ تیری ماں کی بالکل پروا نہ کروں، اگر اس طرح تیری مسرت واپس آسکے۔ مجھ سے اب یہ تیرا حال نہیں دیکھا جاتا۔ اس دن جب شہزادۂ قمر کا پیام تیرے لیے آیا تو میں نے دبی زبان سے کہا تھا کہ رد نہ کیا جائے لیکن ملکہ نے نہیں مانا اور مجبوراً مجھے خاموش رہنا پڑا۔

ریحانہ یہ سن کر چونک پڑی اور بولی کہ:۔

شہزادہ قمر کیا؟ اور کہاں ہے؟ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

دایہ نے کہا" اے ریحانہ! آسمان کی تمام مخلوق میں کرۂ ہوا کی ساری آبادی میں قمر سے زیادہ حسین شاہ زادہ کوئی نہیں۔ وہ بھی ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے اور تم اسے تو نہیں، لیکن اس کے چند خادموں کو ہر رات دیکھتی ہو، اور اب بھی دیکھ رہی ہو۔ یہ ہلالوں کا جھرمٹ جو تم اپنے ملک میں اس وقت درخشاں دیکھ رہی ہو اسی کے ادنیٰ ملازم ہیں۔"

ریحانہ نے کہا" اگر یہ اُسی کے خادم ہیں تو پھر کیوں انھیں واپس بلا کر کہکشاں کو تاریک نہیں کر دیتا۔"

دایہ بولی کہ" یہ اصول نظام کے خلاف ہے۔ جب ایک ملک کے بعض خادم یا کارکن دوسرے ملک میں

چلے جاتے ہیں تو پھر واپس نہیں آسکتے۔ مثلاً جب کرۂ ارض میں راتیں تاریک ہوتی ہیں تو کہکشاں کے تمام قطعات گلزار مجبور ہو جاتے ہیں کہ رات بھر کھلے رہیں اور اس طرح زمین کی تاریکی کو کچھ کم کرسکیں۔ اب اگر ملکۂ کہکشاں چاہے بھی تو اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ ممکن نہیں کہ یہ اپنی خدمت کو جو زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے چھوڑ دیں۔ یہی تو بات ہے کہ ہماری ملکہ اس طرف سے مستغنی ہے، ورنہ آج سارے کہکشاں میں اندھیرا ہوتا اور کہکشاں کے تمام سمندروں کا مدو جزر مفقود۔"

ریحانہ نے بے قرار ہوکر پوچھا "اچھا تو تمھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ شہزادہ قمر بہت حسین ہے؟"

دایہ۔ "اس کا اندازہ تم خود کرسکتی ہو کہ جس کے ادنیٰ خادم ایسے ہوں گے وہ خود کیسا ہوگا، وہ تو اس درجہ حسین ہے کہ ہر گفتگو شعاع ہے اور اس کا ہر مس درخشندگی۔"

ریحانہ۔ "ہاں میں سمجھ گئی۔ اس رات جب میں تنہا کشتی میں چلی جا رہی تھی تو اس نے مجھ سے گفتگو بھی کی تھی اور اس نے میری کشتی کو چھوا بھی تھا، کیوں کہ میں نے ایسی درخشاں شعاعیں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھیں۔ اچھا تو کیا میری مدد تم کر سکتی ہو؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر اسی ساحل پر میں پہنچ جاؤں؟ آہ! کاش یہ میری

آرزو پوری ہو سکتی ہے۔"

ریحانہ نے یہ کہا اور بے قرار ہو کر زار زار رونے لگی۔

۵

سارے کہکشاں پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ رات کے سناٹے میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ مصروف خواب تھی۔ ہلال اپنی متین اور سنجیدہ شعاعوں کو سمندر کی سطح پر پھیلائے ہوئے پانی کی موجوں میں جھولا جھول رہا تھا اور ریحانہ اپنی کشتی میں خاموش تنہا بیٹھی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ متحیر تھی کہ آج وہ شعاعیں کیوں نمودار نہیں ہوتیں۔ آج اس کی کشتی کو ساحل کی طرف کیوں نہیں کوئی لے جاتا۔ کیا شاہ زادہ قمر ملتفت نہیں رہا؟ کیا وہ اپنی رات کو اسی طرح مایوسی کے عالم میں سمندر پر تیراکر گزار دے گی۔ وہ سخت مضمحل تھی اور نہایت آزردہ کہ دفعتاً سمندر ایک نہایت تیز نورانی لہر کے ساتھ شق ہوا اور کشتی تیر کی طرح سمندر کی تہ کی طرف خود غرق ہوتی چلی گئی۔ سب نے ساری کائنات نے، تمام آسمان والوں نے، آسمان کی ہر ہر مخلوق نے دیکھا کہ کہکشاں کا ایک نہایت ہی منوّر و درخشاں تارا ٹوٹا اور بہت دور تک ایک سیمین خط بناتا ہوا چلا گیا۔ کہکشاں کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن سارا آسمان جگمگا اٹھا۔ تمام دنیا چمک اٹھی۔ کچھ دنوں تک دیکھا گیا کہ ایک تارا چاند کے پہلو میں جلوہ گر ہے اور اب بھی کبھی کبھی نظر آجاتا

ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر نے اس کی وہ عزت نہیں کی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں کی صرف چند ساعتوں میں افسانۂ محبت کی یادگار ہماری نگاہوں کے سامنے نمودار ہوکر غائب ہو جاتی ہے۔

آہ! کیسی دردناک ہے اس دل کی داستان محبت جو اپنے محبوب کے لیے اپنی زندگی کی محفل کو اُجاڑ دے۔ اپنی ہستی کی ساری رونق بزم خاک میں ملا دے۔ صرف اس توقع پر کہ محبت کا جواب صرف محبت سے دیا جاتا ہے، صرف اس امید پر کہ جس جلوۂ محبت کی نوید سے دل کو گرویدہ بنایا گیا وہ ہمیشہ قایم رہنے والی چیز ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا، اور کیسی خطرناک ہے وہ داستان شوق جو ایک نازک دل والی کو صرف اس لیے سنائی جاتی ہے کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے گی اور رو دے گی۔ وہ اس کو سُنے گی اور صحیح جان کر اپنی زندگی کو قربان گاہِ فریب پر چڑھا دے گی۔ حالانکہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر اظہار تاسف نہیں کیا جاتا کہ ہم اپنی ایک ادنیٰ خواہش کے لیے کیسی کیسی حسین صورتوں کو برباد، کیسی کیسی بلند فطرتوں کو پست و ذلیل کر دیتے ہیں۔

سچ ہے دنیا میں عورت محبت کرتی ہے، صرف اس لیے کہ وہ محبت پر مجبور ہے۔ اور مرد محبت کرتا ہے، صرف اس لیے کہ وہ اس پر مسرور ہے۔ پھر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ مجبوری جاتی رہے اور ہمیشہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائدار ثابت ہو۔

Very Important

پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر

(فرحت اللہ بیگ)

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں نہ ملے ہیں نہ ملیں گے"۔ جس طرح یہ صحیح ہے اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیے کہ "ماضی ماضی ہے اور حال حال۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے"۔ لیکن خدانخواستہ اگر ان کی ٹکّر ہو گئی، تو سمجھ لیجیے کہ وہی مصیبتیں پیش آئیں گی، جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا کیا مصیبتیں تھیں ان کو بھی سن لیجیے۔ واقعات از سر تا پا غلط سہی مگر پڑھنے کی حد تک ان کو سچ جانیے اور یقین کیجیے۔ ورنہ پڑھنے میں خاک مزا نہ آئے گا۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں، تو بسم اللہ آگے چلیے۔

آؤ حضرت تمہیں بھی دکھلادیں
سیر ماضی کی اس زمانہ میں

سنہ انیس سو کچھ میں، ہم نے تعلیم سے فراغت پائی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک ریاست میں (نام کی جگہ صفر) ہمارے خاندانی تعلقات تھے اس لیے کالج سے نکل، سیدھا ادھر کا رخ کیا یہاں پہنچے، تو کسی نے کہا کہ نوکری کرو، کسی نے کہا کہ تعلیم جاری رکھو، چوں کہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہوا تھا اور وہاں

نوٹ :۔ یہ مضمون بالکل فرضی ہے۔ کوئی صاحب اس کو اپنے سے متعلق نہ فرمائیں۔

کی صحبتیں پیش نظر تھیں، اس لیے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ صورت بھی خود بہ خود پیدا ہو گئی۔

اس ریاست میں میرے ایک عزیز ایک بہت ہی بڑے عہدہ پر تھے انھوں نے مجھ سے کہا "رے میاں میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحب زادے کو تعلیم کے لیے علی گڈھ بھیج رہے ہیں۔ میرا ان کے ہاں بہت اثر ہے۔ اگر کہو۔ تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لیے کہہ دوں۔ تمھاری تعلیم مفت میں ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسوخ کے آدمی ہیں۔ واپسی کے بعد تمھیں کوئی جگہ بھی مل جائے گی۔" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے۔" دوسرے تیسرے ہی روز انھوں نے مجھے بلا کر کہا "لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے نواب صاحب سے تمھارے متعلق سب تصفیہ کر لیا ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ چند روز تم کو اپنے پاس رکھ کر تمھاری طبیعت کا انداز کر لیں۔ تم کو کبھی پرانی وضع کے نوابوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تم بھی اس عرصہ میں ان کی نشست و برخاست کے اور ادب آداب کے سلیقے سیکھ جاؤ گے۔ چھوٹے صاحب زادے صاحب کی طبیعت کا رنگ بھی معلوم ہو جائے گا اور ان شاء اللہ اس طرح تم کچھ فائدہ ہی میں رہو گے۔" میں راضی ہو گیا۔ قرار پایا کہ سہ پہر کو ان کے مددگار صاحب لے جا کر مجھے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا دیں۔ اور تعارف بھی کرا دیں۔

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجیے اور مددگار صاحب کے اسم شریف پر لکیر کھینچ دیجیے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سچی بات ہمیشہ بری معلوم ہوتی ہے۔ کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں اس لیے بہتر یہی ہے کہ۔

خوش تر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بہر حال دو بجے ہی سے ہم نہا دھو کر کپڑے بدل، سیاہ ترکش کوٹ ڈانٹ، دستار پہن اور بگلوس باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی۔ دستار سر پر بار ہو گئی اگرچہ در شملہ "بمقدار علم" کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو الگ ہی رہنے دو۔ اتار کر رکھ دو اور ننگے سر ہی چلے چلو، مگر کیا کیا جاتا۔ وہ نواب صاحب پرانی وضع کے ایسے دل دادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس لیے "قہر درویش برجان درویش" سمجھ کر اس بار کو اٹھانا ہی پڑا۔ ابھی دستار کا تصفیہ پوری طرح نہ ہوا تھا کہ بگلوس نے ستانا شروع کیا۔ پیٹی باندھتے عمر گذری تھی مگر کوٹ کے نیچے پیٹی باندھتے تھے نہ کہ کوٹ کے اوپر۔ کوٹ کے اوپر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ہاتھ ہلا اور اُدھر کوٹ بگلوس کے اوپر گولا بن گیا۔ دامن پکڑ کر نیچے گھسیٹا، برابر کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی مشکل پیش آئی اور پھر اسی ترکیب سے رفع کی۔ ہم اسی کش مکش میں تھے کہ مددگار صاحب اپنی وکٹوریہ میں آ ہی

گئے اور ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچتے اور دستار کو درست کرتے گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھی آگئی۔ آخر خدا خدا کرکے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اترے آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم، نواب صاحب کی عالی شان اور پر تکلف کوٹھی میں داخل ہو گئے تین بج چکے تھے مگر معلوم ہوا کہ ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں۔ اس لیے دونوں کے دونوں بلیرڈ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ریوٹر ایجنسی کی طرح اطلاعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اُٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ منہ دھو رہے ہیں۔ چوب دار پر چوب دار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ ہو رہا ہے۔ اب یہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ خبر آنی تھی کہ کمرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ یا تو ہم ٹٹروں ٹوں دو ہی آدمی بیٹھے تھے یا سارا کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی ادھر سے آیا کوئی ادھر سے۔ کوئی اس کمرے سے نکلا کوئی اس کمرے سے۔ غرض اتنے بڑے کمرے میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب ان کو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبوں کا کیا حوصلہ تھا جو ان سے جھک کر نہ ملتے۔ البتہ مجھ کو دیکھ کر ذرا کھنچتے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا ذرا اوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔ بعضوں کی پیشانی پر بل بھی آیا۔ مگر جب مددگار صاحب نے میرا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ میں کس خاندان سے ہوں۔ تو ذرا

ٹھنڈک پڑ ی۔ ایک صاحب کہنے لگے "سبحان اللہ! اس خاندان کا کیا کہنا۔ آفتاب ہے، آفتاب۔ ارے بھئی میر صاحب تم نہیں جانتے ان کے دادا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی لکھنؤ میں کیا قدر تھی۔ واللہ عجیب آدمی تھے اور بھئی دیکھنا ذرا ان کی شکل مرزا صاحب مرحوم سے کتنی ملتی ہے۔ میں نے تو ان کو بڑھاپے میں دیکھا ہے۔ واللہ جوانی میں عین مین ایسے ہی ہوں گے۔" مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ تقریباً سب کے سب مصاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بہر حال یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چوب دار نے آکر اطلاع دی کہ سرکار بر آمد ہونے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب کے سب اپنی دستاریں سنبھالتے کپڑوں کو ٹھیک کرتے اور بگلوس باندھتے باہر نکل آئے۔ اب تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سن لیجیے۔ مکان کیا ہے، کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں تک آتی ہے۔ سیڑھیوں کے بعد صحن چبوترہ۔ اور .... صحن چبوترہ کے بعد پھر سیڑھیاں ہیں۔ اور یہیں سے کئی منزلہ مردانہ مکان شروع ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں پرانا وقیانوسی سامان بھرا ہوا ہے، ان کمروں کے سامنے جو بر آمدہ ہے اس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لاوارث حاجت مندوں کے لیے پڑی رہتی ہیں۔ ان کرسیوں سے مجھ کو بھی واسطہ پڑا ہے۔ اس کا ذکر آیندہ کروں گا۔ جو بڑی سڑک چکر کھا کے محل سرا کے دروازے کو گئی ہے وہ بلیرڈ روم کے سامنے

سے گذرتی ہے اور یہاں اتنی چوڑی ہو گئی ہے کہ اچھا خاصا صحن نکل آیا ہے۔ بلیرڈ روم کے بالکل سامنے دوسری منزل سے نیچے آنے کا زینہ اور اس کے بائیں طرف اوپر کے بڑے کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھجا ہے۔ چھجے کے اوپر نہایت خوب صورت نیچی سی منڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے لیے مکان کا اسی قدر ہی نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر۔ تو ہم سب یہ سن کر کہ نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں، کمرے سے باہر نکل آئے اور اس طرح لائن باندھ کھڑے ہوئے کہ یہ چھجا ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیرڈ روم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب۔ ہر شخص کی نظر اس چھجے پر لگی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ہی چوبدار نے آواز دی۔ "آداب بجا لاؤ" اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے، مگر میں نے جھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجے پر کھڑے ہیں، بالکل اس طرح کہ گویا فوٹو اتروا رہے ہیں۔ میں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھے کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکڑ کر کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے۔

I am the monarch of all I survey.

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا۔

"جدھر دیکھتا ہوں ادھر میں ہی میں ہوں"

یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو جھکا۔ ہماری اصطلاح میں "سلام کرنا" محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ ذرا جھک کر اس فرض کو ادا کر دو۔ جھکا۔ سلام کیا۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن ادھر ادھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زنا زن ہاتھ چلا رہے ہیں۔ "نقل راچہ عقل" میں نے بھی غپ رکوع میں جا، پٹا کے ہاتھ چلانے شروع کئے۔ مگر کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا جب دیکھا کہ اب سب سیدھے ہو گئے تو میں نے بھی سیدھے کھڑے ہو کر نیت کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔

مگر حضرات آپ ہنستے کیوں ہیں۔ کیا عید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہوں گے، مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل سے ادھر ادھر دیکھنا ہی پڑتا ہو گا کہ دوسروں کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے۔ دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں یا ابھی اور کوئی تکبیر باقی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہمیشہ ایسی ہی الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ پھر آپ کا میرے حال پر مسکرانا یقیناً بے جا ہے۔

جب اس تسلیمات کے جھگڑے سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لاحول ولا قوۃ تو کس مصیبت میں پڑا۔ چل گھر چل،

پھر سوچا کہ ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے اس لطف کا بھی مزہ اٹھالو۔ میں اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا "اوہو۔ یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں ؟" چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود تعارف کرا دیا۔ مددگار صاحب نے کہا۔ "جی ہاں" نواب صاحب مسکراتے ہوئے نیچے اُتر آئے میری تعلیم کا حال پوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے۔ غرض ان ہی باتوں میں شام ہوگئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا۔ "ماسٹر صاحب آپ دونوں وقت آیا کیجیے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں اگر یہاں نہ بھی ہوا تو جہاں ہوں گا چوب دار آپ کو پہنچا دیں گے۔" دربار برخاست ہوا اور سب لوگ بگلوس کھولتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ "ماسٹر صاحب آپ نواب صاحب کو مخاطب کرنے میں ہمیشہ "آپ آپ" کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نہ کہوں تو کیا "تم" کہوں ؟ اردو میں تو "آپ" ہی تعظیم کا لفظ ہے۔" کہنے لگے۔ "نہیں۔ "سرکار" کہیے۔ "خداوندِ نعمت" کہیے۔ "خاوند" کہیے"۔ میں نے کہا میر صاحب یہ موٹے موٹے لفظ تو مجھ سے ادا ہونے مشکل ہیں۔ ہاں کل سے "سرکار" کہنے کی کوشش کروں گا۔ مگر خدا معلوم زبان کو لفظ "سرکار" سے کیا چڑھ تھی کہ کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکلنا تھا نہ نکلا اور ہمیشہ "جناب عالی" اور "جناب والا" ہی سے کام چلا گیا۔

ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے "ماسٹر صاحب آپ کا دولت خانہ بہت دور ہے، صبح آجایا کیجیے۔ دوپہر کا کھانا یہیں تناول فرمائیے۔ شام کو تشریف لے جایا کیجیے۔ ایک کمرے میں آپ کے بیٹھنے اٹھنے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔" میں نے کہا "حضرت یہ دوسروں کے مکان میں آپ انتظام کرنے والے کون؟ اگر نواب صاحب کو میرے ٹھہرانے کا خیال ہوتا تو وہ خود ہی فرما دیتے۔ خدا میری بائیسکل کو سلامت رکھے میرے لیے دور اور نزدیک سب برابر ہیں۔" وہ بے چارے شرما کر خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم نے دربار کے اوقات بھی پوچھ لیے۔ معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے سے گیارہ بجے تک اور شام کے تین ساڑھے تین بجے سے سات آٹھ بجے تک نواب صاحب برآمد رہتے ہیں۔

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوب دار سے پوچھا کہ "نواب صاحب کس طرف برآمد ہوں گے؟" اس نے کہا "میرے ساتھ آئیے" ہم ساتھ ہو گئے اس نے لے جاکر برآمدہ کی ان ہی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا جس کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوب دار ادھر سے نکلتا اس سے پوچھتا کہ "بھئی نواب صاحب آج برآمد ہوں گے بھی یا نہیں؟" وہ یہی کہہ کر چلا جاتا کہ "آپ تشریف رکھیے ابھی یاد ہوتی ہے۔" جب ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو

اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھتا۔ ایک تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں، دوسرے اس طرح جم کے بیٹھنے کی عادت نہیں، تیسرے تنہائی کی کوفت، غرض کیا کہوں کہ کیا حال ہوا۔ جیب سے گھڑی نکالتا دیکھ لیتا۔ ادھر پاؤں بیٹھے بیٹھے سن ہو گئے۔ ادھر دستار کے بوجھ اور بگلوس کے دباؤ نے پریشان کر دیا اور ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اس وقت چوب دار نے آکر کہا۔ "اب آپ جائیے سرکار محل میں تشریف لے گئے۔ شام کو آئیے گا تو ملاقات ہو گی۔" کیا بتاؤں کس قدر غصہ آیا۔ لیکن جز بز ہو کر رہ گیا۔ آخر اپنی جگہ سے اٹھا اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔ شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا مگر لوگوں کے کہنے سننے سے پھر پہنچا۔ ایک چوب دار نے لے جا کر پھر ان ہی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہو گی۔ مگر وہاں کون کس کو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بج گئے۔ اس وقت میں نے دل میں کہا۔ "حضرت۔ اگر یوں ہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہو گی۔ بغیر اطلاع ہی پہونچ جائیں راستہ تو معلوم ہے۔ ہو نہ ہو، نواب صاحب اسی طرف ہوں گے۔ جدھر کل تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہو جائیں گے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ تم روٹھے۔ ہم چھوٹے۔" یہ سوچ، کرسی سے اٹھا، کمرے میں سے ہو، بلیرڈ روم میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آرہی تھی۔ اسی آواز

کی سیدھ پر چلا۔ دیکھا تو کمرے کے باہر ہی نواب صاحب اور ان کے سب مصاحب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا تسلیمات بجا لایا۔ اس مرتبہ اس پڑھے ہوئے سبق کو ذرا اچھی طرح دہرایا۔ پرانے مشاقوں کی طرح ہاتھ میں لوچ تو نہ تھا۔ بلا سے نہ ہو مگر ہاتھ کے جھٹکے سات کے بجائے ان گنت دے ڈالے۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہوا تو نواب صاحب مسکرا کر کہنے لگے "اجی ماسٹر صاحب آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھ کو تو آپ کا بڑا انتظار رہا۔" میں نے کہا۔ "جناب عالی میں تو صبح کو بھی آیا تھا۔ مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں کی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی اگر میں خود بغیر اطلاع نہ چلا آتا۔" یہ سن کر نواب صاحب کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگے۔ "آپ آئے تھے اور مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے کیا معنی۔ میں نے کل ہی کہہ دیا تھا کہ میں جہاں کہیں ہوں آپ کی اطلاع کر دی جائے۔" میں نے کہا۔ "دیکھیے وہ چوب دار صاحب جو پیچھے کھڑے ہیں انھوں نے ہی مجھے وہاں لوٹی ہوئی کرسیوں پرلے جاکر بٹھایا تھا اور کہا تھا کہ "ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے۔" کئی دفعہ یہ بعد میں ادھر سے گذرے بھی مگر ہمیشہ میرے پوچھنے پر یہی جواب دیا کہ۔ "ابھی عرض کر دیتا ہوں۔" اور وہ جوان کے برابر کھڑے ہیں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آٹھ دس مرتبہ ان سے کہا مگر انھوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا۔" غرض میں نے ایک ایک کو لے ڈالا۔ جتنے چوب دار تھے سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر

ہیں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی، چپکا نہ ہوا۔ ایک چوب دار نواب صاحب کے بہت منہ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ ہمت کر کے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر کہا "سرکار" مگر میں نے ان کو آگے چلنے نہ دیا اور کہا "کیا سرکار، سرکار۔ لگائی کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ صحت فرما رہے ہیں۔ بس خاموش رہو اس طرح باتوں میں دخل دینا تمہارا کام نہیں ہے۔" وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے "خاموش" اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بے چارے سمجھے ہوں گے کہ کہیں یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اتر آئیں؟ پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر ہنسنے لگے۔ سمجھے ہوں گے پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے۔ مگر اس روز سے چوب داروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری شکل سے گھبراتے تھے۔ میں گیا اور وہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "آیئے آیئے" نواب صاحب کہیں ہوں مجھے فوراً ہی وہاں پہنچا دیتے۔ نواب صاحب کے چہیتے چوب دار صاحب تو ایسے پریشان ہو گئے تھے کہ اگر میں جاتا اور نواب صاحب واقعی محل میں ہوتے، تو مجھ سے کہتے کہ "ماسٹر صاحب! سرکار محل سے ابھی برآمد نہیں ہوئے۔ آپ جا کر خود کمرا دیکھ لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ سمجھیں میں غلط عرض کر رہا ہوں۔"

علم مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا، نہ پہلے کبھی دیکھا، نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا

کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے، ریشمی باگ ڈور ہاتھ میں لیے۔ ایک خوب صورت گھوڑے کو ملاحظہ کے لیے لائے۔ یہ گھوڑا اسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپیے کو خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی۔ کچھ پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کیا اور کہا "بھئی عجیب چیز ملی ہے" بس اتنا سننا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ گھوڑے کا مقابلہ براق اور رف رف تک سے کر ڈالا۔ غرض دو گھنٹے تک یہی بے سر دپا گفتگو ہوتی رہی، شامت اعمال دیکھو کہ نواب صاحب کا ایک اور گھوڑا تھا۔ اس کو یہ بہت ہی چاہتے تھے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی اور نواب صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں میرا پیارا گھوڑا اس نئے گھوڑے سے نہ دب جائے تو انھوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر ہمارے گھوڑے (نام بتانا گویا سارے راز کا انکشاف کرنا ہے) سے اچھا تھوڑی ہو سکتا ہے؟" یہاں تو سب سرکار کے نوکر تھے بیگن کے نوکر تو تھے ہی نہیں فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ "خداوند نعمت! بھلا گھوڑوں کے تذکرہ میں اس کو کیسے لایا جا سکتا ہے۔ وہ گھوڑا تھوڑی ہے، وہ تو انسان ہے انسان!!" ان کا اتنا کہنا تھا کہ یار لوگوں کو گفتگو کا سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا۔ اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ جب کہیں جا کر نواب صاحب کو تسکین ہوئی۔ اس طرف سے ذرا فراغت پائی تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر، ارشاد فرمایا۔ "مرزا صاحب! آپ نے

اس گھوڑے کے متعلق کچھ نہیں کہا۔" میں نے عرض کی "جناب عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنے کے لیے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا ایک ایک پرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشاءاللہ جب اتنے واقف کار لوگ تعریف کر رہے ہیں تو گھوڑا اچھا ہی ہوگا۔ اگر سچ پوچھیے تو میں اس تمام گفتگو میں یہ بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے۔" نواب صاحب یہ سن کر مسکرانے لگے۔ خیر، ان ہی باتوں میں کوئی آٹھ بج گئے اور دربار برخاست ہوا۔ اب دوسرے دن شام کا ذکر سنیے کہ نواب صاحب نے حکم دیا۔ "ہمارا نیا گھوڑا لاؤ۔" سائیس اسی طرح بنا سنوار کر گھوڑے کو لائے۔ مگر بجائے چلنے کے وہ پھدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب آگ بگولا ہو گئے اور اس سرے سے اس سرے تک سارے سائیسوں کو اور کوچ والوں کو لے ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا، دوسرے نے سائیس کی لاپروائی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر آخر کار بہ غلبۂ آرا یہ تصفیہ ہوا دوسرے گھوڑوں کے سائیسوں نے جل کر اس کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یک قلم موقوف ہیں۔ میں نے جو ان غریبوں پر بلا وجہ آفت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا، آگے بڑھ کر کہا۔ "جناب والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا گیا کہ یہ گھوڑا لنگڑا ہے۔

اگر ذرا غور سے گھوڑے کو ملاحظہ فرمایا گیا ہوتا تو، کل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا۔" میرا یہ کہنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے سب نے بڑے بڑے دیدوں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر کہیں لپٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا برا معلوم ہوا کہنے لگے۔ "ماسٹر صاحب!! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا لنگ کرتا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا؟" میں نے کہا "جناب عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو ان سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کی بجائے میری مذمت پر اتر آتے تو میں کہاں ان سے پیچھا چھڑاتا پھرتا۔ میں سمجھا کہ گھوڑے کا لنگڑاپن بھی کوئی تعریف ہے۔ جو اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔" نواب صاحب نے فرمایا۔ "ان سے نہیں تو چپکے سے مجھ ہی سے کہہ دیا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "عالی جناب کو تعریفیں سننے ہی سے کب فرصت تھی جو مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ملتا۔" قصہ مختصر سارا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بے چارے سائیسوں پر سے آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ جب مصاحبوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ماسٹر صاحب کے پاؤں یہاں جم گئے انھوں نے بھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ بلاتے پاس بٹھلاتے، پان کھلاتے۔ ادھر ادھر کی گپیں اڑتیں، شعر و سخن کے چرچے رہتے۔ غرض کچھ دنوں اچھی گذری۔ میں اس زمانہ میں

تحت اللفظ خوب پڑھتا تھا۔ سب نے صلاح دی کہ نواب صاحب کی مجلسوں میں تم بھی دو ایک مرثیے پڑھو۔ نواب صاحب سن کر بہت خوش ہوں گے۔ میں راضی ہوگیا۔ چند ہی روز بعد محرم آگیا نواب صاحب کو شاید کسی نے اطلاع کردی۔ انھوں نے فرمایا "ماسٹر صاحب! آپ بھی مجلسوں میں شریک ہوا کیجیے"۔ میں نے کہا "بہت خوب"۔ دوسرے روز شام کے چھ بجے مجلس میں شریک ہوا۔ مجلس زنانہ مکان میں ہوئی۔ اندر پردہ ہوگیا۔ محل سرا کے وسط میں جو عمارت ہے اس کے دالانوں میں پردے ڈال کر دو حصے کردیے گئے ایک حصہ میں مردانہ، دوسرے میں زنانہ۔ اندر کا حال تو معلوم نہیں مگر مردانہ حصے کا، کل فرش سیاہ تھا۔ چاندنیاں سیاہ۔ گاؤ تکیے سیاہ۔ قالین سیاہ۔ ممبر سیاہ۔ یہاں تک کہ تمام گھر والوں کا سارے کا سارا لباس دستار سے لگا کر جرابوں تک سیاہ۔ نواب صاحب ممبر کے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگا کر تمام صاحب زادے ان کے کچھ ادھر کچھ ادھر بیٹھ گئے۔ چھوٹی صاحب زادی صاحبہ تھیں وہ نواب صاحب کے پہلو میں آ بیٹھیں اور اشارے کے ساتھ ہی مجلس شروع ہوئی۔ پہلے سوز خوانی ہوئی۔ یہ نہ پوچھو کہ کس طرح ہوئی۔ کئی سوز خواں تھے۔ شاید ہی کسی کو چند منٹ پڑھنے کو دیے ہوں تو دیے ہوں۔ نہیں تو جس کو اور جہاں کہیں نواب صاحب نے چاہا روک دیا۔ روکنے کے لیے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا جاتا تھا کہ "بس"۔ ایک صاحب چار مصرع پڑھنے کے بعد ٹیپ اٹھانا چاہتے تھے "بس" کا اشارہ ہوا اور ان کی آواز کو مدھم سے

پنجم پر جانا نصیب نہ ہوا۔ جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تحت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لیے تو کمال کیا، ورنہ دو ہی بندوں پر بند کر دیے گئے۔ اس سلسلے کے ختم ہونے کے بعد حلقہ کا ماتم شروع ہوا۔ ماتم کے بعد مجلس ختم ہوئی باہر نکل کر سب نے اصرار کیا کہ کل آپ بھی پڑھیں۔ میں نے کہا "حضرت میں مجلس کا رنگ دیکھ چکا۔ بھلا ایسے پڑھنے میں کیا لطف اور سننے میں کیا مزا۔ مجھے تو معاف ہی فرمائیے۔" مصاحبین میں ایک میر صاحب تھے۔ بڑے مزے دار آدمی تھے، کہنے لگے "مرزا صاحب! آج جن لوگوں نے پڑھا وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ کل میں دکھاؤں گا کیوں کر پڑھتے ہیں۔ دیکھوں تو نواب صاحب بیچ میں کیوں کر روک دیتے ہیں۔" دوسرے دن جب میر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے مرثیہ کو بجائے ابتدا سے پڑھنے کے وسط سے شروع کیا اور پہلی ہی بند پر میدان میں اتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت غور سے سن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں کہ "بس" کا اشارہ ہوا اور میر صاحب تلوار علم کیے ہوئے ممبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ اس کے بعد سب نے مجھ پر زور دیا کہ پڑھو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے بھی ایک آدھ دفعہ اشارتاً فرمایا مگر میں ٹال گیا، اور اس طرح سنتے ہی سنتے یہ مجلسیں ختم ہو گئیں۔

محرم کی تیرھویں یا چودھویں تاریخ تھی۔ صبح نو بجے کا وقت

تھا۔ دربار جما ہوا تھا۔ معلوم نہیں، کیوں، ایک دفعہ ہی نواب کو کچھ خیال آگیا۔ حکم دیا کہ "ہمارے جواہر خانہ سے چھوٹا صندوقچہ لاؤ۔" چوب دار صندوقچہ لے آیا۔ اوپر کارچوبی کام سے لپا ہوا سبز مخمل کا غلاف۔ اندر ہاتھی دانت کا صندوقچہ۔ صندوقچہ پر گنگا جمنی جالی کا کام۔ ایسی خوبصورت چیز تھی کہ کیا کہوں؟ نواب صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ پہلے ایک انگوٹھی نکالی۔ اس کو دیکھا بھالا اور رکھ دیا اس کے بعد سونے کی ایک جڑاؤ گھڑی نکالی۔ اس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ دیا پھر ایک چھوٹے چھوٹے دانوں کی تسبیح نکالی۔ اچھی طرح دیکھی بھالی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھا کہ مجھے دکھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے تسبیح لے کر خوب غور سے دیکھا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیشہ ہے یا زمرد۔ دیکھنے کے بعد جس طرح لی تھی اسی طرح واپس کر دی اور کہا "جناب والا! مجھے جواہر کی پرکھ نہیں۔ ممکن ہے زمرّد ہو۔ کسی جوہری کو دکھائیے۔ وہ مجھ سے بہتر بتا سکے گا۔" نواب صاحب نے مسکرا کر تسبیح صندوقچہ میں بند کی اور صندوقچہ واپس بھیج دیا۔ جب دربار برخاست ہوا تو یار لوگوں نے میرا مذاق اُڑانا شروع کیا کہ واہ "ماسٹر صاحب! خوب سمجھے۔ اجی حضرت! تسبیح آپ کو سرفراز ہوئی تھی۔ آپ نے غضب کیا کہ واپس کر دی۔ سلام کر کے لے لیتے نذر گذرانتے۔ بھلا ایسے موقعے کہیں روز روز ملتے ہیں؟ ہم کو دیکھنے کے لیے بھی کوئی چیز دی جاتی ہے تو ہم سلام کر کے اپنی کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا "حضرت! یہ لوٹ مار آپ ہی کو مبارک

ہو۔ اگر نواب صاحب کا ارادہ تسبیح دینے ہی کا تھا تو زبان کس نے بند کی تھی؟ بھلا میری عمر دیکھو اور تسبیح کی سرفرازی دیکھو۔ اس بے جوڑ عطا کا مطلب بغیر سمجھائے سمجھنا میرے لیے دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علی گڑھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھر میں کیا کیا انتظامات ہوئے اس کا علم تو اللہ کو ہے ہاں باہر جو کچھ لاؤ لشکر جمع کیا گیا ہے اس کا حال سن لیجیے۔

ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحب زادے صاحب محل سرا سے باہر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا "بادشاہ لو۔ اب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو، چھانٹ لو۔ ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد دیں گے۔"

سب سے پہلے گاڑی گھوڑوں کا انتخاب شروع ہوا۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کئے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمت گار۔ دو پاؤں دبانے والے۔ ایک کہانی کہنے والا۔ دو باورچی۔ آٹھ سائیس۔ اسی طرح خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا جناب والا! یہ صاحب زادے صاحب پڑھنے جا رہے ہیں یا کہانیاں سننے اور پاؤں دبوانے؟ یہ گاڑیاں، گھوڑے استعمال کے لئے جا رہے ہیں یا پروسیشن نکالنے؟ بھلا اس لاؤ لشکر کے ساتھ تعلیم کیا خاک ہو گی جن صاحب کا انتخاب

اس بہیرو بنگاہ کی نگرانی کے لئے ہوا تھا وہ بگڑ کر بولے "ماسٹر صاحب! نواب صاحب کے صاحب زادے تعلیم کے لیے جا رہے ہیں۔ میرے یا آپ کے بچے نہیں جا رہے ہیں کہ ایک صندوق اٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے" میں نے کہا "اور ہاں جناب عالی! یہ بھی تو بتا دیا جائے کہ خیر، میں تو صاحب زادے صاحب کا اتالیق بن کر جا رہا ہوں، کیا یہ حضرت میرے اتالیق ہو کر تشریف لے جا رہے ہیں"؟ ان کے لئے تو میرا ایک ہی فقرہ کافی تھا۔ بے چارے خاموش ہو گئے جب میں نے دیکھا کہ طوطی کی آواز نقارہ خانہ میں کوئی نہیں سنتا تو میں بھی لاحول پڑھ کر خاموش ہو گیا۔

اس واقعہ کو تین روز گذر گئے۔ ایک دن رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخاست ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ "ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لئے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی دو بجے اسٹیشن پر آ جائیے" میں نے عرض کی "عالی جناب! میں نے ابھی تک چلنے کی نہ کوئی تیاری کی ہے اور نہ میں ایسے فوری حکم کے لئے خود تیار تھا۔ آپ تشریف لے جائیے۔ میں انشاءاللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤں گا" الغرض یہ تصفیہ ہوا کہ تیسرے روز میں یہاں سے روانہ ہوں اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما رہیں۔

دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاری شروع کی شام کو مددگار صاحب سے ملنے گیا۔ ان سے معلوم ہوا

کہ نواب صاحب دو تین ہی اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے۔ مگر صاحب زادے صاحب اور ان کا لشکر آگے چلا گیا۔ مددگار صاحب سے مل کر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔ ایک آدھ چھینک آگئی تھی۔ ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ اس لئے واپس تشریف لے آئے دوسرے دن پھر گیا تو نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحب زادے صاحب کا تار تھا۔ لکھا تھا کہ کالج والوں نے تمام ملازمین اور گاڑی گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہنا ہے تو صرف ایک اتالیق اور ایک نوکر کے ساتھ آ کر رہو۔ ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو۔" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا کہ "خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ بھلا یہ کیا جانیں کہ نوابوں کے لڑکے کس طرح رہتے ہیں اور کس طرح تعلیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے گھوڑے دونوں کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحب زادے صاحب کو بلوا لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کے دشمن بیمار پڑ جائیں۔" میں نے کہا "میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ؟ نواب بن کر نہیں پڑھا جاتا۔ طالب علم بن کر پڑھا جاتا ہے۔ صاحب زادے صاحب کو اگر نواب صاحب بالکل میرے سپرد کر دیں تو میں دو ہی برس میں دکھاؤں کہ کیا سے کیا ہو گیا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دوسرا تار آیا۔ لکھا تھا۔

"میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ واپسی کی اجازت دی جائے۔" میں نے بہتیرا سر مارا مگر میری ایک نہ چلی اور تار دے دیا گیا کہ "فوراً چلے آؤ۔" جب طالب علم ہی نہ رہا تو اتالیق کیسا۔ میں نواب صاحب کو اس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی نہیں گیا۔ مدتیں گذر گئیں، تو بھول گئے ہوں گے۔ مجھے پرانی اور نئی تہذیب کی یہ ٹکر ہمیشہ یاد رہے گی ؂

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب!
ہم تمھیں یاد کیا کرتے ہیں!

(۵)

بجرو

(رشید احمد صدیقی)

میں جس گاؤں کے ایک بزرگ کا حال سنانا چاہتا ہوں وہ شہر یا قصبہ کی آبادی سے بہت دور ایک پہاڑی مقام میں واقع تھا۔ جہاں موجودہ زمانہ کی نعمتوں سے اب تک کسی ایک کا بھی گزر نہیں ہوا تھا مثلاً تعلیم۔ ہسپتال۔ کوتوالی۔ الکشن، ہندو مسلم فساد، گاؤں سدھار اور اسی طرح کی ریڈیو قسم کی اور اور چیزیں۔ بجرو یہاں کے سردار تھے جن کے بارے میں لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ ان سے زیادہ مفید اور مضبوط آدمی گاؤں بھر میں کوئی اور نہیں ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان سے زیادہ جہاں دیدہ اور کارکردہ آدمی وہاں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ اس گاؤں میں نہ کبھی چور آئے اور نہ وبا پھیلی۔ چور اس لیے نہیں آتے تھے کہ بجرو خود کسی زمانہ میں ڈاکو رہ چکے تھے، ایسے ڈاکو کہ ان کی زندگی میں چور اور تھانہ دار دونوں نے عہد کر لیا تھا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے گی جس سے بجرو سے سابقہ پڑنے کا امکان ہو اور بیماری یوں پاس نہیں آتی تھی کہ بجرو کے حکم سے نہ تو کوئی شخص گاؤں میں بے کار رہ سکتا تھا اور نہ سورج نکلنے اور سورج چھپنے کے درمیان گھر کے اندر قدم رکھتا تھا۔

بجرو بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سخت کام کرنے کے بجائے اب انھوں نے یہ مشغلہ اختیار کیا تھا کہ گاؤں بھر کے لوگ دن میں کھیتی باڑی کے کاموں

میں مصروف ہو جاتے تو یہ گاؤں والوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا چارج لے لیتے۔ ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے کسی کے ساتھ کھیلتے کسی کو کھلاتے پلاتے، کسی کو قصے سناتے اور کسی کی گوش مالی کرتے، شام کو ان کی مائیں واپس آکر اپنے اپنے بچے ساتھ لے جاتیں اور مرد بیٹھ کر بجرو کو دن بھر کے کاموں کی تفصیل سناتے، یہ یہ ہوا۔ یہ یہ دقتیں ہیں، یہ یہ ہونے والا ہے۔ ہر ایک کے کام اور ہر ایک کی کارکردگی سے بجرو واقف تھے۔ بجرو ہوں ہوں کرتے جاتے اور جہاں کسی نے واقعات میں گرہ لگانی شروع کی بجرو نے آنکھ اٹھا کر اس طور سے گھورا گویا وہ اس کے بیان کو سمجھنے سے معذور ہیں اور معذور ہی نہیں بلکہ اس کو سزا دینے پر بھی آمادہ ہیں۔

ایک دن برسات کے موسم میں جب کہ کئی دن مسلسل بارش ہو چکی تھی بعض نوجوان دیہاتیوں نے بجرو سے کہنا شروع کیا۔ بجرو دادا سنا ہے یہاں سے بہت دور ایک دیس ہے جہاں انوکھی انوکھی باتیں ہوتی ہیں۔ بغیر کنوئیں یا تالاب کے پانی ملتا ہے، بغیر دیئے کے روشنی ہوتی ہے، بغیر جانور کے سواریاں ہیں، بغیر خط پتر کے حال احوال معلوم ہو جاتا ہے، بغیر کھیتی باڑی کے غلہ ترکاری مل جاتی ہے، عورت مرد ہر وقت کھیلتے کودتے رہتے ہیں، بھوت پریت پکڑ لئے گئے ہیں جو ناچا گایا کرتے ہیں، ایک آدمی کسی کو مار ڈالے تو دس آدمی اسے مار ڈالتے ہیں اور پھر ان دسوں کو مارنے والا کوئی نہیں ملتا، کھیتی کوئی نہیں کرتا، کھاتے سب ہیں۔ بجرو دادا ایک دن ہم کو بھی لے چلو ہم بھی دیکھ آئیں۔

بجرو دادا پہلے تو چپ رہے پھر تمباکو کا ایک نہایت آب دو زقسم کا کش لے کر چلم کو دوسرے کے حوالہ کیا اور بولے بیٹا ٹھیک ہے۔ ہمارا سب دیکھا بھالا ہے۔ اس بستی کو شہر کہتے ہیں۔ ان شہروں کا عجیب حال ہے۔ میں وہاں کے

لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور انھیں خوب جانتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے ناواقف نہیں۔ ان کے مکانات بڑے مضبوط، بڑے خوبصورت اور بڑے ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ان کو کھلی ہوا اور روشنی میسر نہیں آتی یہ کوٹھری میں نہاتے ہیں اور جہاں سوتے ہیں وہیں پاخانہ پھرتے ہیں یہ کام نہیں کرتے ورزش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کھانا دکان پر پکتا ہے اور وہیں کھایا بھی جاتا ہے۔ ان کے کھانا کھانے پکانے کا برتن بھی گندہ ہوتا ہے اس سے زیادہ گندی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں یہ کھانا کھاتے ہیں۔ شہر کی دکان پر کھانا پکتا دیکھو تو تم کو کئی دن بھوک نہ لگے اور ان کے یہاں کے غل غپاڑے سن پاؤ تو رات کو نیند نہ آئے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں درجنوں گھسے پلے سوتے، جاگتے جیتے مرتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چوڑے راستے ہیں لیکن ہر روز اس میں کوئی نہ کوئی کچل کچلا کر مر جاتا ہے۔ جتنا کام نہیں کرتے اس سے زیادہ دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود لڑتے ہیں، دوسرے صلح کراتے ہیں۔ اس لئے ہر صلح دوسرے جھگڑے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ان کے عجیب عجیب کھیل ہیں۔ تم کو تھوڑی دیر میں سارا حال کیسے بتاؤں، کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں، اچھا آؤ تم کو ان کے لڑنے کا حال سناؤں۔ ان کے ہاں لڑائی ایسے شروع ہوتی ہے۔

کسی نے کہا میں اُلّو دوسرے نے کہا میں چمگادڑ، تیسرے نے کہا میں نیل کنٹھ مہادیو۔ ان میں سے ایک اس پر لڑنا جھگڑنا شروع کرتا ہے کہ دنیا میں سب کے سب اُلّو کیوں نہیں ہو جاتے۔ دوسرا کہتا ہے جہاں چمگادڑ ہو وہاں اُلّو کا گزر کیوں ہو۔ تیسرا کہتا ہے نیل کنٹھ مہادیو کے ہوتے ہوئے اُلّو اور چمگادڑ کو جینے کا کب حق حاصل ہے۔ کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ جس جنگل میں صرف

اُلو، چمگادڑ اور نیل کنٹھ مہادیو ہی ہوں وہاں سادھارن سے رہن سہن کیسے ہو سکتی ہے۔ اُلو کو اس پر اصرار کہ ویرانہ میرا چمگادڑ کہتا ہے ویرانہ تیرا ہو تو بسیرا میرا اور نیل کنٹھ مہادیو کا دھرم یہ کہ ویرانہ یا بسیرے سے مجھے سروکار نہیں، نرم چارہ میرا، اس پر ان میں خوب خوب جنگ ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک چیز ہوتی ہے جس کا نام انھوں نے اخبار رکھ چھوڑا ہے۔ سارے رگڑے جھگڑے کا گھر یہی ہے جس طرح وبا کے کیڑے ایک جگہ سے دوسری جگہ لائے لے جائے جاتے ہیں اسی طرح جھگڑے فساد کے کیڑے مکوڑے ان اخبارات سے ہر ہر جگہ پھیلائے جاتے ہیں۔

تم کو وہ مثل تو یاد ہو گی، ایک نے کہا کوّا کان لے گیا اب یہ کوئی نہ دیکھے گا کہ کان موجود بھی ہے یا نہیں، ہاتھ دھو بنچے جھاڑ کوّے کے پیچھے ہولیں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوّے کے پیچھے جانے سے پہلے کان موجود تھا لیکن کوا گو ہار کے بعد دیکھتے ہیں تو کان تو غائب ہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ کسی کی ناک کٹی ہوئی ہے کسی کا ہونٹ کٹا ہوا ہے، کسی کی ایک آدھ ناک گھلوے میں گئی اور کسی کی دم بٹے کھاتے ہیں۔

اس کوا گو ہار پر خوب خوب بغلیں بجائی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میں بھی اس میں پھنس گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے، تمھیں اُلو پسند ہے یا چمگادڑ یا نیل کنٹھ مہادیو۔ میں نے کہا اس سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگے جنگل کی سرداری کا چناؤ در پیش ہے میں نے کہا ظاہر ہے میں الو کا ساتھی ہوں، اس پر چمگادڑ نے کہا الو کیوں بنتے ہو میرا ساتھ دو، میں نے کہا یہ کیوں؟ کہنے لگے مجھ میں خاصیت الو کی ہے اور ولولہ نیل کنٹھ کا، اتنے میں نیل کنٹھ مہادیو ٹائیں ٹائیں کرتے آئے اور میری پگڑی جھپٹ کر چل دیے اُلو نے یہ دیکھا تو لپک کر ایک

ٹھنٹھ پر جا بیٹھا، چمگادڑ الٹا لٹک گیا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

ان کے یہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں ان میں بعض تو ایسی ہیں جنھوں نے سورج اور آسمان بھی نہیں دیکھے ہیں۔ گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، بچے پالتی ہیں اور چکی پیستی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن درو دیوار کی چکی خود انھیں پیس ڈالتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جو صرف پان کھاتی ہیں، چھالیہ کترتی ہیں، شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں۔ لیکن اب ان میں ایک اور قسم پیدا ہو گئی ہے یہ انگریزی بولتی ہیں، ساری پہنتی ہیں اور سینما دیکھتی ہیں۔ شوہر ان کی خدمت کرتے ہیں اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔

شہروں میں ایسے ایسے گھر بنے ہیں جہاں ہر قسم کے جنگلی جانور اور پرند پکڑ پکڑ کے رکھے گئے ہیں جن کو یہ چڑیا گھر یا جانوروں کا عجائب خانہ کہتے ہیں۔ میں ان شہر والوں کی تعریف کروں گا کہ انھوں نے ہر چوپائے یا پرند کے لیے ایسی جگہ بنا دی ہے گویا وہ اسی حالت میں اور اسی مقام پر ہیں جہاں کہ وہ پکڑے جانے سے پہلے تھے۔ جانوروں کو شہری بنانے کی کوشش کرتے کرتے ان کے دل میں یہ سما گئی ہے کہ شہریوں کو جنگلی بنایا جائے۔ ان میں جو سب سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ اب تک جو لوگ خیالات کے ننگے تھے ان کو جسم کا بھی ننگا ہونا چاہئے، چنانچہ ان شہریوں میں جو سب سے زیادہ مہذّب ہے وہ سب سے زیادہ ننگا ہے، ان کے مرد عورتوں نے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں اور اب جنگلوں میں ننگے پھرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس سے تن درستی بڑھتی ہے۔ ننگاپن سات سمندر پار سے آیا ہے۔ اب تک ہندوستان میں بھوکوں کی کیا کمی تھی کہ اس میں ننگوں کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ننگوں کا عجائب خانہ ہوا۔

لیکن ان سب سے زیادہ انوکھا عجائب خانہ وہ ہے جس کو ان شہریوں نے اسکول، کالج، یونی ورسٹی یا بورڈنگ ہاؤس کا نام دے رکھا ہے اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جو اصول انھوں نے چڑیا گھر میں ملحوظ رکھا تھا اس کو انسانوں کے اس عجائب گھر میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں یہ ان کو ایک قسم کا منتر پڑھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں۔ اس عجائب گھر کے عجوبے اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان انسانی جانوروں کو ان کے نگراں ایک ہی طرح کی فضا میں رکھتے ہیں، ایک ہی طرح کا راتب دیتے ہیں۔ ایک ہی قسم کا کام لیتے ہیں، اور ایک ہی قسم کے مداری رکھتے ہیں جو ایک ہی قسم کے کرتب سکھاتا ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے، اے احمقو! جو جان ور اپنے اصلی گھر میں شکار پر زندگی بسر کرتا تھا اسے مردار کیوں کھلاتے ہو، جو میدان میں گھومتا پھرتا تھا، چاند، سورج، پھل، پھول، گرمی، سردی، محنت مشقت کی گردش میں پلا ہے اس کو کالے انچھر بھینس برابر کا سبق کیوں پڑھاتے ہو، جو نقش و نگینے کا کام کرتا تھا اس سے مگدر کیوں ہلواتے ہو، جو کھیت جوتتا تھا اسے گورکنی کیوں سکھاتے ہو، جو تیل بیچتا تھا اسے فارسی کیوں پڑھاتے ہو جو مہا بھارت میں شریک تھا اس سے شکنتلا کا ناٹک کیوں کھلواتے ہو، جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہو اسے یورپ کا خواب کیوں دکھاتے ہو۔ ہرن پر گھاس لادنے سے کیا حاصل، مجنوں کو منطق سے کیا سروکار لیکن یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔

شہر والے اس پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی کلیں ایجاد کر لی ہیں کہ ہم کو اپنے جسم کے کل پرزوں کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں چنانچہ اب ہر چیز کل سے بنائی جاتی ہے ہاتھ لگانا حرام ہو گیا ہے۔ بونا، جوتنا۔ کاٹنا

بننا، بنانا، بھرنا، لانا، لے جانا، ہنسنا، بولنا، لڑنا، جھگڑنا، بگڑنا، سنورنا، مرنا۔ جینا سب مشین سے ہوتا ہے جو ہاتھ پاؤں سے کام کر سکتے تھے ان کو کام نہیں ملتا جن کو کام مل سکتا ہے ان کو ہاتھ پاؤں چلانا نہیں آتا۔ مجھے اس وقت ہنسی آتی ہے جب شہر والے ہمارے حال پر ترس کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گاؤں والے جاہل ہوتے ہیں۔ ہماری بے وقوفی اور غریبی نے ہمیں تباہ کر رکھا ہے۔ ان کو کون بتائے کہ جب تک وہ ہماری فکر میں رہیں گے ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود ان کے حال پر ترس کھائیں اور ذہن و دماغ کی گمراہیوں نے انھیں جس تاریک دَل دل میں پھنسا دیا ہے۔ اس سے ہم اپنے ہاتھ پاؤں کی فیض بخشیوں سے ان کو نجات دلائیں۔

ان میں بڑے بڑے ودوان لوگ ہیں، جن کے سامنے آکاش اور پاتال کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کی نت نئی ایجاد نے قدرت کے کھیلوں کو ماند کر دیا ہے لیکن زندگی کے کھیل نے ان کو زچ کر دیا ہے۔ ہم دیہاتی زندگی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ کھیل کی زندگی پر مرتے ہیں۔ وہ ایجاد کر سکتے ہیں، ایثار سے محروم ہیں، ہم ایثار کو سب کچھ سمجھتے ہیں ایجاد کے چکر میں نہیں پھنستے۔

وہ اپنی پوری کوشش اس پر صرف کرتے ہیں کہ غلہ پیدا کرنے کے جتنے جدید ترین اصول ہیں ہم ان کو کام میں لائیں۔ لیکن ان کو کون سمجھائے کہ ان کو پوری کوشش اس پر صرف کرنی چاہیئے کہ روپیہ ایجاد کرنے کے جتنے جدید ترین اصول ہیں انھیں بھول جائیں۔ ہم کو وہ ہمارے فرائض طرح طرح سے ریڈیو پر سناتے ہیں اور اس ہنسی دل لگی سے اپنا اور بعض دوسروں کا جی بہلاتے ہیں لیکن ان کے فرائض دوسرے جب ہوائی جہاز اور مشین گن سے

سناتے ہیں تو ہم کو ان پر بڑا ترس آتا ہے۔
ان شہر والوں نے ہماری دیکھا دیکھی اپنے گرد آلود دھواں دھار شہروں میں چھوٹے بڑے باغ اور پارک بنا رکھے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کو صاف ہوا اور کھلی جگہ مل جایا کرے۔ ان کے پھل پھول کی کیاریاں بھی اتنی ہی مصنوعی ہوتی ہیں جتنے کہ ان کے مرد عورت اپنی زندگی اپنی رہن سہن اپنے لباس اور وضع اور اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے مصنوعی ہو جاتے ہیں۔ ان کو وہ تفریح کہاں نصیب جو گاؤں والوں کے حصہ میں آئی ہے ہم محنت کرتے ہیں اور اپنے باغ اور کھیت خود بناتے ہیں اور پھر ان کی شادابی نمو اور فراوانی پر خوش ہوتے ہیں۔ یہ خوشی ہمارے جسم اور روح دونوں کو تازہ کرتی اور قوی بناتی ہے ہمارے پیڑ پودے ہمارے رنج وراحت سے متاثر ہوتے ہیں۔ شہر والوں کو شہر کے پارک میں یہ چیزیں کہاں نصیب ان میں وہ ربط اور وابستگی کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو زندگی کے دھارے پر ہم کو اُبھارے رہتی ہے۔
ہم بیمار پڑتے ہیں تو اپنے ہی گھاس پات سے اپنا علاج کرتے ہیں۔ یہ بیمار ہوں تو جب تک ولایت کی دوائیں اور ولایت کے اسلحے میسر آئیں یہ اچھے نہیں ہو سکتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی وجہ سے ولایت سے یہ چیزیں آنی بند ہو جائیں تو شہر والے کتنے دن تک زندہ رہیں۔ یہ ہماری بیماری پر بڑا شور مچاتے ہیں اور ہر روز ہمیں بیماری سے بچنے کی ترکیبیں بتایا کرتے ہیں۔ لیکن ان کو نہیں معلوم ان کے صحت مندوں سے ہمارے بیمار اچھے ہیں۔

کتّے

(پطرس بخاری)

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے۔ دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے۔ کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی۔ تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے "مطلع" عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کر پوری غزل "مقطع" تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو

غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے، یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجیے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کردی۔ اور پھر منہ بند کرکے کھڑا ہوگیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کردی۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سَر نہ پیر۔ تان پر تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔

سے گلے بازی کیے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجیے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیّات ہے، لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر "آیۃ الکرسی" آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، چونکہ

گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی بڑا کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھر تھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ مصرع تاریخ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان

کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں، بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفند یار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہئے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کردیں گے لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کردے گا؟

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کردیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کردے تو آپ ہی کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کرسکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے

ابھی تو کیا تیر مارے گا! بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب۔ سڑک بند ہے، تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ "دیو جانس کلبی" سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹ کھٹایا لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت

حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا بیٹھے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچا، فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفیؔ تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشا کے لیے باعث ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کردے اور کاٹنا شروع کردے؟

حالی کا مرتبہ اردو ادب میں

(مجنوں گورکھپوری)

تاریخ ادب میں حالی کی تین حیثیتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ شاعر تھے اور غزل کے شاعر۔ میں یہ کچھ صرف اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان کی کلیات کا ایک خاصا جزو غزلیات پر مشتمل ہے، بلکہ اس لیے کہ ایک مخصوص قسم کا تغزل ان کی فطرت کا ایک اہم عنصر تھا، اور یہ عنصر جیسا کہ میں ابھی واضح کرنے کی کوشش کروں گا غیر شعوری طور پر اس وقت بھی اپنا کام کرتا رہا جب کہ حالی کا دل پرانی شاعری سے سیر ہو چکا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے ان کو شرم آنے لگی تھی۔

حالی کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا کوئی شعر حال سے خالی نہیں ہوتا۔ حالی کے یہاں نہ کہیں زبردستی کی پرواز تخیل ہے نہ خواہ مخواہ کے تشبیہات و استعارات، جو بات ہے "دو اور دو چار" کی طرح سیدھی مگر عالم گیر حقیقت۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو ہر شخص اپنے دل کی بات کی طرح مانوس پاتا ہے چند اشعار سنیے:-

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت | پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
گھٹ گئیں کچھ تلخیاں ایام کی | بڑھ گئی ہے یا شکیبائی بہت
آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا | دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ | ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

اک عمر چاہیے، کہ گوارا ہو نیش عشق | رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور | عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل | کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

عشق سنتے تھے جسے ہم یہ وہی ہے شاید | خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا | ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ | اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

رنجش والتفات و ناز و نیاز | ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

کر دیا خوگرِ جفا تو نے | خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قیامت ہے یہ بحث جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے — ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

ان اشعار سے ہم پر یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ حالی اپنے کو ہمیشہ لئے دیئے رہنے والے آدمی تھے۔ ان کی شاعری غیر معمولی ضبط و خودداری کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے نالے رکتے ہوئے اور ان کی فریادیں تھمتی ہوئی ہیں۔ ان کو جو چیز دوسرے اردو شاعروں سے ہمیشہ ممتاز رکھے گی وہ عقل و جذبات کے درمیان ایک توازن ہے۔ اگر حالی مسدس لکھنے سے پہلے ہی مر گئے ہوتے اور صرف غزلیات چھوڑ جاتے تو آج یہی توازن ان کا سب سے بڑا اکتساب اور اردو شاعری میں سب سے زیادہ قابل قدر اضافہ ہوتا۔ اسی

توازن کا نتیجہ ہے کہ وہ غزلیں ہوں یا "مسدس" یا کچھ اور حالی کے کلام میں جوش نہیں ہوتا تاثیر ہوتی ہے۔

حالی نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ وہ شاگرد تو مرزا غالب کے تھے لیکن تقلید میر کی کرتے رہے اور مستفیض شیفتہ سے ہوتے رہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں یہ تینوں اثرات نہایت خوب صورت اور مکمل آہنگ کے ساتھ نظر آتے ہیں ان کے یہاں خستگی اور گھلاوٹ میر کی ہے ظرف اور تمکنت کے تیور غالب کے ہیں، شائستہ عمومیت اور مہذب سادگی شیفتہ کی ہے۔ غالب کے شاگرد کو غالب کی پیچیدہ خیالی اور مشکل گوئی سے جس چیز نے بچا لیا وہ یقیناً شیفتہ کی صحبت کا فیض تھا۔

حالی کئی لحاظ سے ہم کو انگریزی کے دو مشہور شاعر گرے (GRAY) اور کالنس (COLLINS) کی یاد دلاتے ہیں جو انگریزی ادب میں رومانی تحریک (ROMANTIC MOVEMENT) کے پیش رو سمجھے جاتے ہیں۔ جب ہم حالی کی غزلیات پڑھتے ہیں تو ہم کو وہ کالنس سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ اپنے وقت کی غزل گوئی کے رسوم و قیود سے بغیر کسی قسم کی بغاوت کئے ہوئے غزل کو حالی نے گویا از سرِ نو پیدا کیا ہے اور اس میں نئی کیفیتیں بھر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں جو مخلصانہ سادگی اور نرمی اور سنبھلی ہوئی غم گینی پائی جاتی ہے وہ بھی کالنس ہی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ گرے کی خصوصیت حالی میں یہ ہے کہ وہ اپنے راز کو کبھی اچھی طرح افشا نہیں کرتے۔ بس زیر لب

کچھ کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ گرے کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہتا تھا۔

جہاں تک اسلوب کی بے ساختگی اور زبان و دل کی یک جہتی کا تعلق ہے حالی ورڈسورتھ سے بھی بہت قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان کے کلام میں اس عارفانہ اُداسی اور مفکرانہ گداز کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی" جو ورڈسورتھ کی امتیازی خصوصیت ہے، لیکن اردو شاعری کو انھوں نے وہی پر خلوص سادگی وہی پر تاثیر بے رنگی اور وہی دھیمی موسیقیت دی جو ورڈسورتھ نے انگریزی شاعر کو دی۔ اور پھر یہ بھی نہ بھولئے کہ حالی سے اردو شاعری میں جدید اسلوب کی وہی تحریک شروع ہوئی جو انگریزی شاعری میں ورڈسورتھ اور کولرج سے ہوئی تھی۔ اردو شاعری میں آج جو سیدھاپن اور فطری انداز پایا جاتا ہے اس کے مُوجد اور مُبلّغ حالی ہیں۔

حالی کی شاعری فلسفہ اور تصوف سے بالکل خالی ہے۔ ان کے اندر کوئی فلسفیانہ بصیرت یا عارفانہ رمز شناسی نہیں تھی۔ یہ ان کی فضیلت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ فضیلت اس اعتبار سے کہ یہی خصوصیت ہے۔ جو اور شاعروں کے مقابلے میں اُن کو عوام الناس سے قریب اور مانوس بنائے ہوئے ہے۔ ورنہ ان کے اندر گہرائیاں ہوتیں تو وہ اس قدر عام فہم شاعر نہ ہو سکتے۔ لیکن یہی ان کی کمزوری ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کمی کی وجہ سے وہ نہ تو کوئی تعمیری تخیل (Constructive Idea)

پیش کر سکے اور نہ اپنے ترنم میں کوئی تنوع (Variety) پیدا کر پائے۔ اُن کی ہر دھن ایک ہی دھن معلوم ہوتی ہے جس کو مجموعی اعتبار سے مرثیہ کی دھن کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ مرثیے کی عامیانہ قسم کی عام رقت پسندی اور یا (افادی الاقتصادی مرحوم کی اصطلاح میں) تیسرے درجے کے ابل پڑنے والے جذبات سے وہ منزلوں دور تھے، مگر اس کا سبب وہی توازن و استقلال ہے جس سے حالی کا خمیر ہوا تھا اور جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔

حالی میں ہم کو دو چیزیں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ واقعیت (Realism) اور عقلیت (Rationalism) انھیں دو چیزوں نے ان کو بچایا اور انھیں سے وہ کھوے گئے۔ یہی واقعیت اور عقلیت ہے جس نے حالی کے کلام میں وہ توازن اور ٹھہراؤ پیدا کیا جو کسی دوسرے اردو شاعر میں نہیں ملتا۔ لیکن یہی معقول پسندی اور واقع کے ساتھ بڑھی ہوئی موانست تھی جس نے حالی کو اس لطیف ہذیان سے محروم رکھا جس کو شیلی "پرآہنگ دیوانگی" (HARMONIOUS MADNESS) کہتا ہے اور جو دنیا کے مشہور ترین شاعروں اور ادیبوں کی فطرت رہی ہے، ورنہ وہ اس سہولت کے ساتھ اپنا انداز بدل نہ دیتے اور زمانے کے ان میلانات اور اثرات کے سامنے اتنا جلد سر نہ جھکا دیتے جو سرسید کی سرکردگی میں تحریک علی گڈھ کی صورت میں رونما ہو رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کے لیے اسی طرح ضروری اور مفید تھی جس طرح مریض کے لیے دوا۔ مگر پھر یقیناً

وہ اسی طرح وقتی اور عارضی بھی تھی اور اس زمانہ کی چیز تھی جب کہ مسلمان "فرنگی کے پیسے کو مردار" سمجھتے تھے، اور محنت و مشقت کو باعث ننگ و عار۔ آج جب کہ ہم ڈوم اور چنڈال کے پیسے کو بھی حلال سمجھنے کے لیے تیار ہیں یہ تحریک ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ تاریخ کے صفحات میں اہمیت رکھ سکتی ہے۔ ایسی تحریکوں سے مغلوب ہو کر رہ جانا شاعر کے لیے زیبا نہیں۔ اس کو کسی خاص جگہ یا کسی خاص زمانے کی چیز ہو کر نہ رہنا چاہیے۔ اگرچہ اپنے زمانے اور اپنی جگہ سے بالکل بے نیاز اور بے پروا رہنا بھی شاعر کی ایک ناقابل معافی کمزوری ہوتی ہے۔

حالیؔ نے زمانے کے ساتھ گھاٹے پر صلح کر لی اور اس کے ہر نشیب و فراز کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میرؔ و مصحفیؔ کی روش کو چھوڑ کر "مغرب کی پیروی" میں لگ گئے۔ کرتے کیا؟ زمانے کے میلان کے ساتھ مصالحت کر لینا نہ صرف سرسید کی تحریک تھی بلکہ حالیؔ کی اپنی طبیعت کا تقاضا بھی تھا۔ ان کے پیغام کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے:

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ — کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

خیر عام مسلمانوں کو ہوا کا رخ پہچان کر چلنا نہ اس وقت آتا تھا نہ آج تک آیا، لیکن حالیؔ نے اپنی قوم کا کفارہ تنہا اپنی ذات سے ادا کرنے

کا بیڑا اٹھایا۔ زمانے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا تو ساری مروجہ شاعری ان کو ایک "ناپاک دفتر" نظر آنے لگی اور شاعروں کی حیثیت ان کی نگاہ میں "قلی اور لفر" سے بھی گر گئی۔ لیکن شاعری ان کی فطرت میں داخل تھی اور اس کو دبا کر فنا کر دینا ایسا آسان کام نہ تھا۔ خود حالی "مسدس" کے دیباچے میں تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات اندرونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔" آخر کار دبائے ہوئے بخارات کو نکلنے کے لئے رخنہ مل گیا۔ "غزل کے شاعر" نے لاکھ اپنی فطرت سے انکار کیا پھر بھی "مسدس" کا شاعر ہو کر رہا۔

یہ نہایت کھلی ہوئی بات ہے کہ "مسدس حالی" تبلیغی یا تنظیمی ادب (PROPAGANDA LITERATURE) کے عنوان کی چیز ہے، یعنی وہ ایک خاص دور کی چیز ہے اور اس خاص دور میں بھی ملک کی ایک محدود جماعت کے لئے مخصوص ہے، لیکن وہ شاعری بھی ہے اور صحیح معنی میں شاعری اور اس حیثیت سے اس کے اندر وہ تمام خصوصیات کہیں کم اور کہیں زیادہ موجود ہیں جو حالی کے عام شاعری بالخصوص غزلیات میں ملتی ہیں۔ خود حالی نے مسدس کو اُبالی کھچڑی سے تشبیہ دی ہے جو مزہ لے کر نہیں کھائی جا سکتی۔ شمس العلماء مولانا امداد امام اثر، حالی کی رائے سے اتفاق کر کے کہتے ہیں کہ ہر چند کی برائی اور مرغ

مسلّم پکانے والا ایسی کھچڑی نہیں تیار کر سکتا۔ میں خود مسدس حالی کو ایک قسم کی پرہیزی کھچڑی سمجھتا ہوں مگر وہ اُبالی ہنڈی نہیں ہے۔ اس میں نمک اور دوسرے مسالے بڑے انداز سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کو مزہ لے کر نہ کھائیے تو البتہ محض اُبالی معلوم ہوتی ہے۔ یہ پکانے کے کمال کی دلیل ہے۔

"مسدس" کی شان نزول کچھ بھی ہو، اس کے وجود میں آنے کے اسباب و محرکات لاکھ غیر شاعرانہ سہی، اس میں سرسید کی غیر شاعرانہ تحریک کے جو اثرات نمایاں ہیں وہ سب مسلم لیکن مسدس کے ایک خاصے حصے میں جو شخص شاعری نہیں پاتا وہ مذاق شعری کے محدود اور ناقص ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ بقراط کا جامہ پہن کر بھی حالی کا انداز قد چھپ نہیں سکتا اور صاف پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ ہم کو ہمارے مرض کا سبب اور اس کی علامت سمجھاتے ہوئے آئے ہیں لیکن ہم کو دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ طبیب خود بھی اس مرض کے جراثیم سے بچا ہوا نہیں ہے جس کو تشخیص کرکے اس نے "تپ دق" بتایا ہے۔ البتہ اس نے اپنے پھیپھڑوں میں مصنوعی طور پر آکسیجن بھر لیا ہے جس سے اس میں تندرستی کی عارضی علامتیں آگئی ہیں۔

جو لوگ مسدس کو شاعری نہیں سمجھتے ان کو عموماً دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو تبلیغ و تنظیم کو شعر و ادب سے بلند و برتر چیز مانتی ہے اور مسدس کو شاعری کہنا اس کی توہین سمجھتی ہے۔ اس جماعت میں خود حالی بھی شامل ہیں۔

بلکہ اس کے علم بردار ہیں۔ دوسری جماعت وہ ہے جس نے شاعری کے مفہوم کو بے انتہا محدود کر لیا ہے اور جس کے مذاق کو غزل کے سہل اور سستے کیف و اثر نے بگاڑ دیا ہے۔ تمام اصناف سخن میں غزل سے بڑھ کر دھوکے کی چیز کوئی نہیں۔ غزل شاعری کی معراج بھی ہو سکتی ہے اور اس کو خوار و رسوا بھی کر سکتی ہے۔ اس سے ہمارے مذاق میں اگر ایک طرف تمکنت آ سکتی ہے تو دوسری طرف ہمارے مذاق کے رکیک اور مبتذل ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ بہر حال اگر ہم مسدس میں شاعری محسوس نہیں کرتے اور اس سے لطف نہیں اٹھا سکتے تو اس کی ذمے دار اگر ایک طرف ہماری بڑھی ہوئی نقاہت ہے تو دوسری طرف اسی حد تک ہمارے مذاق کی عامیانہ سہل پسندی بھی ہے۔ ورنہ مسدس غیر شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی شاعری ہے۔

مگر ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی نگاہ میں شاعر کا مرتبہ مبلّغ یا مُصلح سے زیادہ بلند ہے۔ یہ لوگ کسی ایسے پیغام کو جو وقتی مصلحتوں پر مبنی ہو یا جس کا روئے خطاب کسی محدود جماعت کی طرف ہو شاعری کا صحیح موضوع نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر زبان و مکان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ازل اور ابد کو اپنی مٹھی میں لیے ہوتا ہے۔ مسدس کا پیغام صرف ایک چھوٹی سی جماعت اور وہ بھی ایک خاص وقت کے لیے تھا۔ جو اب دفن ہو کر رہ گیا۔ پھر اس کو شاعری کیوں کر کہا جائے؟

شاعری تو وہ ہے جو اپنی تمام وقتی اور مقامی خصوصیات کے ساتھ بھی عام بنی نوع انسان کے لیے یا کم از کم کثیر سے کثیر تعداد کے لیے ابد تک روشنی اور صدائے بازگشت کا کام کر سکے۔ مسدس پر اس جماعت کا یہ اعتراض کافی اہم اور قابل غور ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسدس جہاں تک پیغام ہے وہاں تک شاعری نہیں ہے۔ مسدس کے اہم ترین ٹکڑے وہ ہیں جن میں یا تو اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھائی گئی ہے یا ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ ابتری اور پستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ ٹکڑے شاعری کے مکمل نمونے ہیں جن کو پڑھ کر ماننا پڑتا ہے کہ حالیؔ کی غزلیات اور ان کے مسدس میں در اصل کوئی تصادم نہیں ہے۔ وہی انسانی دردمندی اور دل سوزی، وہی جذبات کی سنجیدگی، وہی دھیما ٹھہرا ہوا لب و لہجہ اور وہی زبان کی سادگی اور بے ساختگی، غرض کہ وہی تمام خصوصیات جو ان کی قدیم و جدید غزلیات یا "حب وطن" یا "مناجات بیوہ" کو شاعری بنائے ہوئے ہیں، مسدس میں بھی نمایاں ہیں۔ مسدس اپنے موضوع پر اور اپنی نوعیت کی نہ صرف اردو میں بلکہ شاید دنیا کی اور زبانوں میں بھی سب سے زیادہ طویل نظم ہے، اس پر بھی ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی اور کسی زمانے میں بار بار پڑھی گئی۔ ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والوں کو تھکا دیتی ہیں، لیکن مسدس اس عیب سے پاک ہے۔ شروع سے آخر تک پڑھ جائیے

نہ کہیں گرانی محسوس ہوگی نہ جی اکتائے گا۔" مسدس حالی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تسلسل اور زبان کی سنجیدہ سادگی ہے جو اس کی تاثیر کے وزن کو اول سے آخر تک یکساں قائم رکھے ہوئے ہے۔"

آخر میں مسدس کے متعلق پھر بھی ایک سوال ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مسدس شاعری ہے تو کس مرتبہ کی اور مستقبل میں اس کو کیا حیثیت دی جائے گی؟ یہ تو نہایت کھلی ہوئی سی بات ہے کہ غزل یا خالص داخلی شاعری کی تاثیر و مقبولیت تو مسدس جیسی نظم کو کبھی میسر نہیں ہو سکتی۔ آخر فردوسی، نظامی اور جامی یا ہومر ورجل اور ڈانٹے کو غزل یا (LYRICS) والی بات کہاں نصیب ہوئی لیکن انسان کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب کہ وہ غزل کی ساحرانہ آواز کی طرف سے کان بند کر لیتا ہے۔ اور یہ ساحرہ اپنی تمام ساحری کے باوجود اس کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں خارجی شاعری کا وجود ہی نہ ہوتا۔ جو لوگ آج غزل کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور اس کو بے حیثیت اور ذلیل ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ خیر اپنے مذاق شاعری کو ناقابل اعتبار ثابت کر رہے ہیں لیکن جو لوگ شاعری کو صرف غزل تک محدود رکھتے ہیں وہ بھی اپنی تنگ حوصلگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہمارے مذاق کو ابھی بہت کچھ وسیع، متوازن اور مہذب ہونا ہے۔ مسدس غزل نہ سہی لیکن مرثیہ ضرور ہے اور نہایت بلند معیار کا، جو حیثیت مجموعی ہم کو افسردہ

اور بے دم نہیں کر دیتا۔ تاریخ اسلام کے ایک خاص رخ کو اس سے زیادہ دل کش اور پر تاثیر پیرائے میں نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔

رہ گیا یہ سوال کہ آئندہ مسدس کو کیا حیثیت ملے گی؟ میرا خیال ہے کہ اس کو کسی قوم کی "منظوم انجیل" (BIBLE) کا درجہ تو نہیں حاصل ہو سکتا۔ لیکن اردو مرثیوں سے تو اسے بلند مانا ہی جائے گا اس لیے کہ اس میں تغزل کے لطیف عناصر بھی موجود ہیں اور اگر ہم کو غم دنیا سے سر اٹھانے کی اتنی مہلت ملی کہ شعر و ادب سے لطف اٹھا سکیں تو آئندہ یقیناً وہ اس سے زیادہ پڑھی جائے گی جتنی کہ اس وقت پڑھی جاتی ہے۔ اپنے وقت میں تو وہ شاعری سے زیادہ پیغام سمجھی گئی، اب وہ زمانہ آ رہا ہے کہ اس کو شاعری میں شمار کیا جائے۔

اگر حالی کی مسدس میں کوئی فلسفہ تمدن (SOCIAL PHILOSOPHY) یا کوئی واضح اور متعین مرکزی تخیل ہوتا یا اگر اس میں کوئی مسلسل اور مربوط داستان بیان کی گئی ہوتی تو آج وہ رامائن، مہابھارت، شاہ نامہ، الیڈ اور پیراڈائز لاسٹ کے ٹکر کی چیز ہوتی۔ تاہم ان تمام خصوصیات سے معرّا ہوتے ہوئے بھی مسدس جتنی پڑھی گئی ہے شاید ہی اس قسم کی کوئی دوسری طویل نظم پڑھی گئی ہو۔

حالی کی تیسری حیثیت سے بحث کرنا باقی ہے۔ یعنی ان کی تنقید نگاری۔ یہ حالی کی وہ حیثیت ہے جس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ یہاں آ کر رائیں ایک ہو جاتی ہیں۔ حالی نے نہ صرف اردو شاعری کو جدید راستے پر لگایا بلکہ وہ اردو تنقید

اور سیرت کے بھی مجتہد ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سیرت اور تنقید نگاری میں مغربی اصول فن کو رواج دیا، اور اردو میں ادب کی ان دو اہم صنفوں کو معیار کی چیز بنا کر پیش کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید میں حالی اردو کے ڈرائڈن (DRYDEN) ہیں۔ جس طرح ڈرائڈن نے انگریزی تنقید میں نئی روح پھونکی اور جدید فن تنقید کی بنیاد ڈالی اسی طرح حالی نے اردو تنقید کو تذکرہ نگاری کی سطح سے بلند کر کے ایک علمی اور تحقیقی فن کی صورت دی۔

جو خصوصیات حالی کی شاعری میں گنائی گئی ہیں وہی ان کی تنقیدوں کی بھی شان امتیازی نظر آتی ہیں، یعنی وہی توازن اور وہی معقول پسندی۔ سرسید کے ساتھ انھوں نے جس بڑھی ہوئی عقیدت پسندی اور جانب داری کا اظہار کیا ہے اس کے لیے اگر رواداری کا ایک حاشیہ چھوڑ دیا جائے اور اس جگہ ان کو محض اردو کا باسویل (BOSWELL) تصور کر لیا جائے تو اردو میں ایسا معقول پسند اور منصف مزاج نقاد دوسرا نظر نہیں آتا یہاں بھی وہ افراط و تفریط کے قائل نہیں۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ بغیر ماتھے پر شکن ڈالے ہوئے اپنی جنچی تلی رائے دیتے چلے جاتے ہیں اور اس کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی بات اتنی گہری نہ ہونے پائے اور زبان و بیان میں کہیں اتنی ادبی خصوصیات نہ اکٹھا ہو جائیں کہ وہ مدرسہ کی چیز ہو کر رہ جائے اور ہر خاص و عام اس کو نہ سمجھ سکے۔ شاعری ہو یا نثر، حالی ہر جگہ میر کی طرح اس مقولے پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔

بات میری ہے گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پھر ایک صاحب اسلوب کی حیثیت سے دیکھا جائے تو بھی حالی اردو نثر میں ایک زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ اگر سرسید کے ساتھ حالی کی نثر وجود میں نہ آجاتی تو غالب کی نثر کے باوجود اردو نثر اسی جگہ رہ جاتی جہاں مرزا رجب علی بیگ سرور نے اس کو چھوڑا تھا اور اس قابل نہ ہوتی کہ اپنی ادبی حیثیت قائم رکھتے ہوئے بے تکلفی اور سہولت کے ساتھ کسی سنجیدہ موضوع پر بحث کر سکے۔ سرسید کی اخباری نثر میں ادبی جان بالکل نہیں تھی اور اس سے اردو میں کوئی ادبی تحریک نہیں شروع ہو سکتی تھی، اس لیے کہ کوئی ادیب ان کے اسلوب کی تقلید نہیں کر سکتا تھا۔ حالی سے اردو نثر کے اسلوب میں وہی تحریک شروع ہوئی جو انگریزی میں بیکن (BACON) سے ہوئی۔

PART I

2/12/-

Pr. S. A Kaul (urdu)
A Rawadara
Srinagar 2.